

VERSES OF JIHAD IN SURAH AL-ANFAL IN LIGHT OF AL-EKLEEL FE ISTINBAT AL-TANZEEL - RESEARCH ANALYSIS

الاکلیل فی استنباط التزیل کی روشنی میں سورۃ الانفال کے جہاد سے متعلق مخصوص مضامین کا ایک تحقیقی جائزہ

شبیر احمد عثمانی ریسرچ سکالر شعبہ علوم اسلامیہ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

عبدالحی اچکزئی پروفیسر شعبہ اسلامیات بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

ABSTRACT: Abdul-Rahmān ibn Abī Bakr ibn Muḥammad Jalāl al-Dīn Suyūfī: 1445–1505 AD) Al-Suyuti was born on 3 October 1445 AD (1 Rajab 849 AH) in Cairo, Egypt. His mother was Circassian. And his father was of Persian origin. According to al-Suyuti his ancestors came from al-Khudayriyya in Baghdad. His family moved to Asyut in Mamluk Egypt, hence the nisba "Al-Suyuti". His father taught Shafi'i law at the Mosque and Khanqah of Shaykhūn Cairo, but died when al-Suyuti was 5 or 6 years old. Al-Suyuti died on 18 October 1505. His major works is 1. Tafsir al-Jalalayn (Arabic: Commentary of the Two Jalals'); a Qur'anic exegesis written by Al-Suyuti and his teacher Jalal al-Din al-Mahalli. 2. Al-Itqān fī 'Ulum Al-Qur'an (translated into English as The Perfect Guide to the Sciences of the Qur'an. 3. Al-Tibb al Nabawi (Arabic: Prophetic medicine') 4. Al-Jaami' al-Kabir (Arabic) 5. Al-Jaami' al-Saghir (Arabic) 6. Dur al-Manthur (Arabic) in tafsir 7. Alfiyyah al-Hadith 8. Tadrib al-Rawi (Arabic) both in hadith terminology 8. History of the Caliphs (Tarikh al-khulafa) The two parties met in combat at Badr on the seventeenth of Ramadan. When the two armies confronted each other and the Holy Prophet noticed that the Quraish army outnumbered the Muslims by three to one and was much better equipped, he raised his hands up in supplication and made this earnest prayer with great humility: "O Allah! Here are the Quraish proud of their war material: they have come to prove that Thy Messenger is false. O Allah! now send that success that Thou hast promised to give me. O Allah! If this little army of Thy servants is destroyed, then there will be left none in the land to worship Thee." Instead of gloating over the victory, the moral weaknesses that had come to the surface in that expedition have been pointed out so that the Muslims should try their best to reform themselves. It has been impressed upon them that the victory was due to the success of Allah rather -than to their own valor and bravery so that the Muslims should learn to rely on Him and obey Allah and His Messenger alone. The moral lesson of the conflict between the Truth and falsehood has been enunciated and the qualities which lead to success in a conflict have been explained. In this Article I tried my best to analyses his tafseer alkanil fi asnbat altanzeel particular topics about surah e anfal .

Keywords: Surah Al-Anfal, Verses of Jihad, Al-Ekleel fe Istinbat al-Tanzeel.

تعارف مؤلف: علماء کی درس و تدریس کی زینت پانچ سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف علم کی جہاں کا آفتاب و مہتاب جلال الملت والدین علامہ جلال الدین سیوطی معروف و مشہور شخصیت کے مالک ہے آپ کی حیات جاوداں کے بارے میں تاریخ

تفسیر والمفسرین کے مولف غلام احمد حریری مرحوم تحریر فرما ہیں: ”نام نامی جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمان بن ابی بکر سیوطی ہے، آپ شافعی المسلک تھے ماہ ربیع 849 ہجری کو پیدا ہوئے ابھی پانچ برس سات ماہ کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا والد نے آپ کو چند لوگوں کی تحویل میں دے دیا تھا جن میں کمال بن ہمام کا نام قابل ذکر ہے۔ آپ نے ان کی حفاظت و تربیت کا حق ادا کر دیا۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن کریم اور بہت سی متون زبانی یاد کر لیں۔ آپ کے تلمیذ علامہ داؤدی کا بیان ہے کہ علامہ سیوطی کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد اکاون ہیں۔ آپ پانچ سو سے زائد کتب کے مصنف و مؤلف ہے، امام سیوطی سرعت تصنیف میں عدیم النظر تھیں۔ داؤدی کہتے ہیں کہ میرا چشم دیدہ واقعہ ہے کہ استاد گرامی ایک دن میں تین بڑے اجزاء تحریر کر لیا کرتے تھے سیوطی علم حدیث اور اس کے متعلقہ فنون متون اور اسانید کے روات و رجال اور استنباط احکام میں یکتائے روزگار تھے وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے دوا لکھ احادیث یاد ہیں۔ اور اگر کچھ اور حدیثیں ملتے تو میں انہیں بھی یاد کرتا جب چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو دیوبی علاقے ست علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو ذکر و عبادت کے لئے وقف کر دیا فتویٰ اور تدریس تک ترک کر دی۔ روضۃ المقیاس میں سکون پزیر ہوئے اور وفات تک وہی رہے اب کے بہت سے مناقب و کرامات ہیں آپ نے بہت عمدہ اشعار بھی کہے ہیں۔ جو علمی فوائد اور شرعی احکام سے متعلق ہیں۔ آپ نے 19 جمادی الاولیٰ 911ھ شب جمعہ کو وفات پائی۔“ 1

جلال الدین سیوطی حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے۔ آپ نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد عمدة الاحکام للنووی، منهاج: لابن مالک، اور الفیہ: للبیضاوی حفظ کر لیں۔ آپ نے مصر کے نامور اساتذہ سے تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، بیان، طب وغیرہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ۸۶۹ھ میں سیوطی فرضہ حج ادا کرنے کے لیے گئے اور وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ سفر حج کے دوران میں انھوں نے ” النحلة الزکیة فی الرحلة المکیة: اور ” النفعة المسکیتة والتحفۃ المکیة“ تصنیف کیں۔ 2 اس کے بعد ۸۷۰ھ کے اوائل میں قاہرہ واپس آئے اور اپنے والد کے مدرسہ شیخونہ میں مدرس ہو گئے۔ ۸۹۱ھ میں آپ کو معروف مدرسہ البیبرسیہ میں بھیج دیا گیا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر آپ کو ۹۰۶ھ میں اس منصب سے الگ کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کے جانشین مدرس کی وفات کے بعد آپ کو دوبارہ اسی عہدے کی پیش کش کی گئی جسے آپ نے قبول نہ کیا اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ آپ نے ۱۸ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔ 3

علامہ سیوطی کثیر التالیف علماء میں سے تھے، اپنی نادر روزگار 500 سے زائد تصنیفات کا گراں قدر مجموعہ اپنے پیچھے چھوڑا جن کی فہرستیں مختلف لوگوں نے ترتیب دی ہیں، ڈاکٹر محمود احمد غازی اپنے محاضرات قرآنی میں فرماتے ہیں: ”علامہ جلال سیوطی مشہور مفسر محدث اور فقیہ بلکہ ہر فن کا مولا ہے۔ جن کی کم و بیش پانچ سو کتابی موجود ہیں۔“ 4 مولوی عبدالحلیم چشتی نے فوائد جامعہ بر

عجلہ نافعہ، میں 506 کتب کی فہرست ترتیب دی۔ 5 اسماعیل پاشا بغدادی نے آپ کی تصانیف کی ایک فہرست ترتیب دی ہے۔ جبکہ آپ کے ہم عصر علماء میں سے کسی ایک کی بھی تصانیف کی تعداد اس قدر نہیں ہے۔ 6

تفسیر الاکلیل فی استنباط التزیل کا ایک مختصر جائزہ:

قرآن مجید بے شمار علوم و فنون کا خزانہ ہے۔ اس کے متعدد مضامین میں سے ایک اہم ترین مضمون اس کے احکام ہیں جو پورے قرآن مجید میں جا بجا موجود ہیں۔ احکام القرآن پر مبنی آیات کی تعداد پانچ سو یا اس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن مفسرین کرام نے جہاں پورے قرآن کی تفاسیر لکھی ہیں، وہی احکام پر مبنی آیات کو جمع کر کے الگ سے احکام القرآن پر مشتمل فقہی تفسیری مجموعے بھی مرتب کئے ہیں۔ احکام القرآن پر مشتمل کتب میں قرآن مجید کی صرف انہی آیات کی تفسیر کی جاتی ہے جو اپنے اندر کوئی شرعی حکم لئے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ قصص، اخبار و غیرہ پر مبنی آیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ علامہ سیوطی کی تفسیر ”الاکلیل فی استنباط التزیل“ بھی اسی انداز کی لکھی گئی ایک منفرد تفسیر ہے، جس میں علامہ سیوطی نے پورے قرآن میں موجود احکام پر مبنی آیات کی تفسیر قلم بند کی ہے۔

احکام القرآن پر قرون اولیٰ سے لے کر آج تک بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ پیرایہ میں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، مگر علامہ سیوطی کی تفسیر ”الاکلیل فی استنباط التزیل“ کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے، اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مختصر و احسن انداز اور بہترین پیرایے میں ان احکام کا استقصاء کیا ہے۔

احکام القرآن پر علامہ سیوطی کا مرتب کردہ مجموعہ ”الاکلیل فی استنباط التزیل“ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مفید مجموعہ ہے، اس فقہی تفسیر میں علامہ سیوطی نے فقہی احکام و مسائل کی بہت مختصر، آسان اور سہل انداز میں تشریح فرمائی ہے۔ اس تفسیر میں علامہ سیوطی نے عموماً شافعی مسلک کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہی احکام کا استنباط کیا ہے مگر باین ہمہ و قفا فوقاً دوسرے مشہور فقہی مسالک کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک جید فقہی عالم اور مفتی کے لئے یہ تفسیر اہم فقہی ماخذ ہے جو دوسرے بہت ساری فقہی تفاسیر سے مستغنی کرنے والی ہے، علامہ عبدالقادر الکاتب اس تفسیر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”علامہ جلال الدین سیوطی کی یہ تفسیر اس بلند و برتر ہے مجھ جیسا عاجز اس کی تعریف کرے، یہ تفسیر روز اول سے علماء اور فقہاء کے استنباطات کا مرجع ہے۔ اگر لوگوں کی طبائع جامدہ کا خیال نہ ہوتا تو علماء ہر وقت اس کی طرح طرح کی خدمات کرتے رہتے، اور لوگوں کے لئے اسے سہل بناتے۔“ 7

سورۃ الانفال کے جہاد سے متعلق مخصوص مضامین کا جائزہ:

مذکورہ آرٹیکل میں جہاد سے متعلق متعدد مضامین مثلاً: جہاد سے فرار، مال غنیمت کے احکام و اقسام اور جہاد میں قید ہونے والے قیدیوں کا حکم وغیرہ کا جائزہ لیا جائیگا۔

1۔ جہاد سے فرار:

میدان جنگ سے بھاگنا کیسا ہے؟ اس کے کیا احکام ہیں؟ کب بھاگنا جائز اور کب ناجائز ہے؟ یہ اور اس جیسے تمام سوالات کے جوابات علماء کرام نے سورۃ الانفال کے آیت نمبر ۱۵، ۱۶ میں دے دی ہیں، چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُوهُمْ الْأَذْبَارَ" 8 "اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔"

میدان جنگ سے بھاگنے کے بارے میں اس آیت کے تشریح میں علامہ سیوطیؒ الاکلیل فی استنباط التزیل میں کچھ یوں رقمطراز ہے: إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا {الآیۃ فیہا تحریم الفرار من الزحف وأنه من الکبائر إلا من ولی متحرفاً للقتال بأن یرہم الفرۃ وهو یرید الکرة أو متحيزاً إلى جماعة یستنجد بها وذهب قوم إلى أن الفرار من الزحف غیر محرم، وقالوا: الآیۃ خاصۃ بیوم بدر لقوله: {يَوْمَئِذٍ} 9 "اللہ تعالیٰ کا قول: "إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا" اس آیت میں جنگ سے بھاگنے کی حرمت ہے، اور یہ کہ جنگ سے بھاگنا بڑے گناہوں میں سے ہے، البتہ اگر کوئی اس لئے بھاگتا ہے کہ بظاہر (دشمن کو) دکھاتا ہے کہ میں تو بھاگ رہا ہوں جبکہ وہ واپس دوبارہ حملہ کا ارادہ رکھتا ہو یا ٹھکانہ پکڑتا ہو ایک ایسی جماعت کے ساتھ جو اسے دشمن سے نجات دے، تو پھر جائز ہے، جبکہ علماء کی ایک جماعت نے اسے مطلقاً جائز قرار دیا ہے، اس آیت کے بارے میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ خاص ہے جنگ بدر کے ساتھ، انہوں نے اس آیت میں لفظ "یومئذ" سے استدلال کیا ہے۔"

سورۃ الانفال کے اس آیت کے تحت علامہ سیوطیؒ کی تفسیر اور تشریح سے معلوم ہوا کہ جنگ سے بھاگنے والے مجاہدین کے حکم کے بارے میں دو مذاہب ہیں، پہلا مذہب ان حضرات کا ہے جو فرماتے ہیں کہ جنگ سے بھاگنا حرام و ناجائز ہے جبکہ ان کے مقابلے میں دوسرا مذہب ان حضرات کا ہیں جو کہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ مخصوص ہے جنگ بدر کے ساتھ، غزوہ بدر کے علاوہ دیگر جنگوں سے بھاگنا کوئی جرم نہیں ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ جنگ سے بھاگنا جرم ہیں ان کا فرمان ہیں کہ جب دشمن سامنے ہو یا مسلمانوں پر جنگ مسلط کر دی جائے تو اس صورت میں پیٹھ پھیر کر بھاگنے کی بجائے جان پر کھیل جانا چاہیے، جو مجاہد دشمن کے مقابلے میں پیٹھ پھیر کر بھاگے گا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے گا اگر وہ اسی حالت میں مر جائے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا کیونکہ اس نے اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے مفاد پر اپنے آپ اور اپنے مفاد کو ترجیح دی، البتہ جنگی حکمت عملی کے تحت مورچہ چھوڑنا یا ایک محاذ کے بجائے اپنے کمانڈر کے حکم پر دوسرے محاذ پر جانا یا دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ملنے کی خاطر پیچھے ہٹنا ہے تو اس میں کوئی

جرم نہیں کیونکہ حالت جنگ میں یہ تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے، حالت جنگ میں بھاگنا اس لیے سنگین جرم ہے کہ ایک شخص کے بھاگنے سے دوسرے ساتھیوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں۔ اس طرح بھاگنا مسلمان کی غیرت کے منافی ہے، جنگ سے فرار موت کے ڈر سے ہوتا ہے۔ جبکہ موت کی جگہ اور وقت مقرر ہے لہذا بھاگنا بزدلی کے سوا کچھ نہیں ہے، احادیث میں جنگ سے بھاگنے کو بڑا گناہ

قرار دیا گیا ہے، امام بخاریؒ اس حوالے سے ایک حدیث روایت کرتے ہوئے رقمطراز ہے: ”عَنْ أَبِي بَرْزَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُفَوِّقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا بُنَّ قَالَ الشِّرْكُ بِاللَّهِ وَالسَّيْحَرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الرِّبَا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالنَّوْثَى يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ“¹⁰

”حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ کرام نے استفسار کیا۔ اے اللہ کے رسول! وہ کون سی ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، کسی کو ناجائز قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال ہڑپ کرنا، لڑائی کے دن میدان سے بھاگنا، معصوم اور بے گناہ عورتوں پر الزام لگانا“

علماء کرام اور فقہاء عظام نے یہ بھی شرط لکھی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں کم نہ ہو، اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنے شہرہ آفاق تفسیر میں اس شرط کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں: ”اکثر اہل علم کے نزدیک میدان جنگ سے مقابلہ کے وقت بھاگنا گناہ کبیرہ ہے، چاروں اماموں کا قول یہی ہے مگر سب کے نزدیک یہ شرط ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نصف سے کم نہ ہو“ اگر نصف سے کم ہو تو دشمنوں کو چھوڑ کر بھاگنا جائز ہے۔“¹¹

لڑائی سے بھاگنے کی مذکورہ شرط ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ صاحب نے بھی بیان فرمائی ہے: ”لیکن یہ گناہ کبیرہ اس وقت تک ہے جبکہ دشمنوں کی تعداد دو گنا سے زائد نہ ہو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو پھر بھی ثابت قدم رہنا اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا ہی افضل ہے۔ جیسے جنگ موتہ میں اہل اسلام کی تعداد صرف تین ہزار تھی اور ان کے مقابل قیصر کی فوج دولاکھ تھی، لیکن غلامان مصطفیٰ نے پرچم اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیا، فاتح اندلس طارق رحمۃ اللہ علیہ صرف سترہ سو جانبازوں کے ساتھ راڈرک شاہ اندلس کے ستر ہزار شہسواروں سے ٹکرایا اور ان کو پکچل کر رکھ دیا۔“¹²

ان علماء کرام کے برعکس علماء و فقہاء کا دوسرا طبقہ رائے رکھتا ہے کہ لڑائی سے بھاگنا کوئی جرم نہیں ہیں یہ مذکورہ آیت کریمہ خاص ہے غزوہ بدر کے ساتھ، علامہ طبریؒ ان حضرات کے مذہب کو بیان فرماتے ہیں: ”فقال قوم: هو لأهل بدر خاصة، لأنه لم يكن لهم أن يتركوا رسول الله صلى الله عليه وسلم مع عدوه وينهزموا عنه، فأما اليوم فلهم الانهزام. ذكر من قال ذلك: حدثنا محمد بن المنثري قال، حدثنا عبد الأعلى قال، حدثنا داود، عن أبي نضرة في قول الله عز وجل: (ومن يولهم يومئذ دبره)، قال: ذاك يوم بدر، ولم يكن لهم أن ينحازوا“¹³

"کچھ علماء نے کہا کہ یہ بدر کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ ﷺ کو دشمنوں کے ساتھ چھوڑ کر اور خود بھاگ جائے، اور جہاں تک بات ہے آج کل کا تو آج کل بھاگ جانا جائز ہے، داود نے ابی نصرہ سے اللہ کے ارشاد: (ومن یولہم یومئذ دبرہ) کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس کا تعلق یوم بدر سے ہے، اس دن ان کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ بھاگ جائے۔"

اسی مذہب کو تفسیر مظہری میں کچھ زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ صحابہ میں ابو سعید خدریؓ اور تابعین میں حسن بصریؒ، ضحاک، قتادہ اور دیگر حضرات کی طرف منسوب ہے کہ: "حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا: مقابلہ سے روگرداں ہونے کی ممانعت صرف اہل بدر کے ساتھ مخصوص تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے، انہی کیلئے بھاگنا جائز تھا۔ اگر بھاگتے تو کہاں جاتے، مشرکوں کی ہی طرف لوٹ کر جانا پڑتا۔ بدر کے بعد تو (ہر لڑائی میں) مسلمان باہم ایک دوسرے کیلئے پناہ کا مقام تھے، بھاگنے والا لوٹ کر بھی مسلمان کی طرف سمٹ کر آئے گا، اسلئے بدر کے بعد قتال سے فرار گناہ کبیرہ نہیں۔ حسن، قتادہ اور ضحاک کا بھی یہی مسلک ہے۔ یزید بن ابی حبیب نے کہا: بدر کے دن فرار ہونے والے کیلئے تو اللہ نے دوزخی ہونے کی صراحت فرمادی لیکن اس کے بعد احد کے بعد جو لوگ میدان قتال سے روگرداں ہوئے ان کے متعلق فرمایا: اَلَمَّْا اسْتَزَلُّهُمْ الشَّيْطَانُ يَبْغِضُ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَى اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ پھر حنین کے دن فرار ہونے والوں کے متعلق فرمایا: ثُمَّ يَنْتُزِبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلٰی مَنْ يَّشَاءُ۔" 14

اس تفصیل کو نقل فرمانے کے بعد قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا مذہب اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل رد ہے، اجماع کے خلاف ہونے کی وجہ سے میں اس کو قابل اتباع نہیں سمجھتا۔ "یہ قول اجماع امت کے خلاف ہے اور احد و حنین میں بھاگنے والوں کے متعلق جو آیات مذکور ہیں، وہ تو ان لڑائیوں میں بھاگنے والوں کو گناہگار قرار دے رہی ہیں، اول جگہ صراحت ہے کہ بھاگنے والوں ہی کی بعض نازیبا حرکتوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈمگم گادیئے اور اللہ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ دوسری آیت میں ہے: تم منہ پھیر کر بھاگے، پھر اللہ جس کی توبہ چاہے گا قبول فرمالے گا، ظاہر ہے کہ معافی اور قبول توبہ بغیر ارتکاب گناہ کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ہلاکت آفریں چیزوں میں قتال سے بھاگنے کا شمار کیا ہے۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اور اصحاب سنن نے حضرت صفوان بن عسال کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت اَنْ تَجْتَنِبُوا کِبٰیْرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ بِکُفْرٍ عَنْکُمْ سِتّٰیْکُمْ کی تفسیر میں ہم نے کبائر کی تشریح کر دی ہے، لہذا مندرجہ ذیل آیت کی و عید عام ہے (صرف اہل بدر کی خصوصیت نہیں)۔" 15

خلاصہ کلام یہ کہ جنگ سے فرار ہونے والے جماعت کے بارے میں علماء مفسرین اور فقہاء کرام کے دو مذاہب ہیں ان میں ابو سعید خدریؓ، حسن بصریؒ، ضحاک، قتادہ وغیرہ کا ہے انہوں نے آیت مذکورہ کو جنگ بدر کے ساتھ مخصوص قرار دیکر بھاگنا جائز قرار دیا

جبکہ دوسرا مذہب جمہور فقہاء کرام اور علماء کا ہے جن میں آئمہ اربعہ سرفہرست ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں مومنین کو ثبات و قرار کا حکم ہے یعنی مسلمانوں پر میدان جہاد میں ثابت قدم رہنا واجب ہے اور مقابلہ کفار سے فرار حرام ہے۔ مجرد و صورتوں کے یا تو یہ کہ پسپائی سے کافروں کو دھوکہ دینا مقصود ہوتا کہ دشمن غافل ہو جائے پھر پلٹ کر دفعۃً اس پر حملہ کرے ظاہر میں بھاگنا ہو مگر درحقیقت مقصود حیلہ اور داؤ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ مقصود اصلی بھاگنا نہ ہو بلکہ بے سروسامانی کی وجہ سے اپنی مرکزی جامعیت میں پناہ لینا ہو تاکہ ان کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد و قتل کرتے تو ایسی پسپائی گناہ نہیں ہاں جبکہ پسپائی محض لڑائی سے جان بچا کر بھاگنے کی نیت سے ہو تو وہ گناہ ہے۔

2۔ مال غنیمت کے اقسام و احکام: جنگ سے بھاگنے کے احکام بیان کرنے کے بعد علامہ سیوطیؒ نے ایک اہم مسئلہ مال غنیمت کے اقسام اور اس کے تقسیم کے احکام بیان فرمائے ہیں چنانچہ سورۃ الانفال میں ہے: "وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ" 16 "اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔"

علامہ سیوطیؒ الاکلیل فی استنباط التزیل میں اس آیت کی تفسیر و تشریح فرماتے ہوئے بہت ہی عمدہ انداز میں تحریر فرماتے ہیں: "قوله تعالى: {وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ} الآية فيها ذكر الغنمة وأنه يجب قسمتها أخلاصاً، أربعة منها للغنمين، والخمس الباقي يقسم خمسة أسهم لرسول الله صلى الله عليه وسلم سهم ولذي القربى سهم ولليتامى سهم وللمساكين سهم ولابن السبيل سهم، وفيها أن أداء الخمس من شعب الإيمان لقوله: {إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ} 17 "اللہ تعالیٰ کا قول: {وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ} اس میں مال غنیمت کا تذکرہ ہے اور یہ کہ اس کے تقسیم کا طریقہ کار یہ ہو گا کہ اسے پانچ حصے کر دیا جائیگا چار حصے مجاہدین کو دئے جائیں گے اور باقی ایک کو پانچ حصے کر کے ایک حصہ رسول اللہ کا ایک آپ ﷺ کے رشتہ داروں (بنی ہاشم اور بنی مطلب) کا ایک یتامی کا ایک مساکین کا اور آخری ایک حصہ مسافروں کو دیا جائیگا، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خمس کی ادائیگی شعب الایمان میں سے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے {إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ} اس آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے مال غنیمت کی تقسیم اور اس کی اقسام و احکام ذکر فرمائے ہیں مگر اس بحث کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھنا ضروری ہے وہ یہ کہ کافروں سے حاصل ہونے والا مال دو قسم پر ہیں:

1. مال غنیمت: مال "غنیمت" اس مال کو کہتے ہیں جو کافروں سے جنگ لڑنے کے بعد ہاتھ آئے۔ 18 عمیم الاحسان صاحب

نے بھی التعریفات الفقہیہ میں یہی تعریف ذکر فرمائی ہے: "أما المأخوذ بقتال فيسمى غنمة" 19

2. مال فبی: امام راغب اصفہانیؒ مفردات القرآن میں مال فبی کے متعلق لکھتے ہیں: "ف" اس مال کو کہتے ہیں جو

بغیر جنگ کے حاصل ہو، جیسے وہ مال جو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مصالحت کے نتیجے میں حاصل ہو، یا کوئی ذمی مال چھوڑ کر مر

جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو اور وہ مال جو جزیہ اور خراج کے طور پر حاصل ہو۔ "20 اسی بات کو محمد بن علی تھانوی حنفیؒ نے بھی مختصر الفاظ میں یوں بیان فرمائی ہے: "الفیء هو المال المأخوذ من الکفار بغیر قتال کالخراج والجزیة۔" 21

التعریقات الفقہیہ میں محمد عمیم الاحسان صاحب بھی مال فنی کی وہ تعریف نقل فرماتے ہیں جو امام راغب اصفہانی اور محمد بن علی تھانوی حنفیؒ نے نقل فرمائی ہے: "الفیء: هو المال المأخوذ من الکفار بغیر قتال، کالخراج والجزیة" 22

چونکہ اس مقام پر مذکورہ آیات کا تعلق مال فنی کے بجائے مال غنیمت سے ہیں لہذا ہم مال غنیمت کا ہی کچھ رواد بیان کریں گے۔ اس آیت کریمہ کے مطابق مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے اور آیت میں مذکور لوگوں کے لیے ہوگا، جبکہ باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والوں پر عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیے جائیں گے، پیدل مجاہد کے لیے ایک حصہ اور گھڑ سوار کے لیے دو حصے، ایک حصہ اس کے لیے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے ہوں گے، احکام القرآن کے مشہور مفسر علامہ ابو بکر جصاص حنفیؒ لکھتے ہیں: "کفار سے قتال کے ذریعے جو مال و اسباب حاصل کیا جاتا ہے غنیمت کا لفظ اس کے لئے اہم ہے، اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہوتا ہے اور باقی چار حصے مال غنیمت حاصل کرنے والوں کے لئے ہوتے ہیں۔" 23

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس بحث کا بہت ہی اچھوتے انداز میں خلاصہ ذکر فرمایا ہے: "جو مال غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے، جسے خدا کی نیابت کے طور پر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام وصول کر کے پانچ جگہ خرچ کر سکتے ہیں۔ اپنی ذات پر اپنے ان قرابت داروں (بنی ہاشم و بنی المطلب) پر جنہوں نے قدیم سے خدا کے کام میں آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر یا محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا اور مد زکوٰۃ وغیرہ سے لینا ان کے لیے حرام ہوا۔ یتیموں پر، حاجت مند مسلمانوں پر، مسافروں پر۔ پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے، وہ لشکر پر تقسیم کئے جائیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس کے پانچ مصارف میں سے "حنفیہ" کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہل قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت قدیمہ کی بناء پر ملتا تھا البتہ مساکین اور حاجت مندوں کا جو حصہ ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار مساکین اور اہل حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہیے۔" 24

یہاں ایک بات یہ بھی محل نظر رہے کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ شہسوار کو دو حصے دئے جائیں گے جبکہ پیدل والے مجاہد کو ایک حصہ دیا جائیگا، اس کے برخلاف صاحبین اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ شہسوار کو تین حصے اور پیدل مجاہد کو ایک حصہ

دیاجایگا، فقہ حنفی کی مشہور متن قدوری میں یہ مسئلہ اس طرح مذکور ہے: "یقسم أربعة أخماسها بين الغانمين للفارس سهان وللراجل سهم عند أبي حنيفة وقال: للفارس ثلاثة أسهم" 25 یہی بات علامہ مرغنائی ہدایہ میں بھی بالکل اسی طرح تحریر فرماتے ہیں چنانچہ حضرت کچھ یوں رقمطراز ہے: "یقسم الأربعة الأخماس بين الغانمين " لأنه عليه الصلاة والسلام قسمها بين الغانمين " ثم للفارس سهان وللراجل سهم " عند أبي حنيفة رحمه الله " وقال للفارس ثلاثة أسهم " وهو قول الشافعي رحمه الله " 26

اب رہی دوسری بات کہ باقی جو خمس رہ گیا اس کی تقسیم کا کیا طریقہ کار ہو گا تو اس حوالے سے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات تو محقق ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اس کے رشتہ دار تو فوت ہو گئے باقی رہے تین اصناف یعنی یتامی، مساکین اور مسافر تو ان تین اصناف کے درمیان باقی ماندہ خمس کو تقسیم کیا جائیگا، قدوری میں مرقوم ہے: "وأما الخمس فيقسم على ثلاثة أسهم: سهم لليتامى وسهم للمساكين وسهم لأبناء السبيل۔۔ وسهم النبي صلى الله عليه وسلم سقط بموته كما سقط الصفي وسهم ذوي القربى كانوا يستحقونه في زمن النبي ﷺ" 27 "جہاں تک بات ہے باقی خمس کا تو اس کو تین حصے کر کے ایک یتیموں کا ایک مساکین کا اور ایک مسافروں کا ہو گا، نبی کریم ﷺ اور اس کے رشتہ دار جس طرح کہ وہ نبی ﷺ کے زمانے میں مستحق ہوا کرتے تھے، چونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں لہذا ان کا حصہ ساقط ہو جائیگا۔" اس پورے بحث کا لب لباب یہ ہوا کہ مال غنیمت کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ یتامی، مساکین اور مسافروں کا ہو گا، جبکہ باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والوں پر عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیے جائیں گے، پیدل مجاہد کے لیے ایک حصہ اور گھڑ سوار کے لیے دو حصے، ایک حصہ اس کے لیے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے ہوں گے۔

3- جہاد میں قید ہونے والے قیدیوں کا حکم: جہاد سے متعلق ایک ضروری امر جو ہر جنگ میں سامنے آتا رہتا ہے وہ قیدیوں کا مسئلہ ہے اسلام میں قیدیوں کا معاملہ سب سے پہلے جنگ بدر میں سامنے آیا جس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی سورۃ الانفال میں اس حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَإِمَّا تَنْفَقَهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ" 28 "اگر تم انکو لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ انکو دیکھ کر بھاگ جائیں۔ عجب نہیں کہ انکو (اس سے) عبرت ہو۔"

اس آیت کی تفسیر علامہ سیوطیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہوئے قیدیوں کے احکام کے بارے میں اس طرح لکھا ہے: "قوله تعالى: {فَإِمَّا تَنْفَقَهُمْ فِي الْحَرْبِ} الآية. استدلل به من قال بقتل الأسرى وأنه لا يجوز إبقاؤهم، وقال إنه ناسخ لقوله: {فَإِمَّا مَتَّ بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءٌ} وقيل أنه منسوخ به" 29 "اللہ تعالیٰ کا قول: {فَإِمَّا تَنْفَقَهُمْ فِي الْحَرْبِ} الآية. اس آیت سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا جائیگا اور ان کو زندہ رکھنا جائز نہیں ہے، اور یہ آیت ناسخ ہے {فَإِمَّا مَتَّ بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءٌ} کے لئے جبکہ ان کے برعکس دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ اس کو {فَإِمَّا مَتَّ بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءٌ} کو اوپر والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔"

اس آیت کریمہ کے تحت علامہ سیوطیؒ نے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بیان فرمایا ہے مگر اس سے پہلے کہ ہم جنگی قیدیوں کا حکم بیان کرے ضروری ہے کہ اس آیت کا شان نزول بھی بیان کیا جائے تاکہ اصل مضمون سمجھے میں آسانی ہو، شان نزول کی روداد یہ ہے کہ جب بدر کا معرکہ پیش آیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے درج بالا آیت لمکم فیما اخذتم نازل فرمائی جس میں فدیہ لینے پر زجر فرمائی، جامع الترمذی میں اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں بیان فرمائی گئی ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ وَجِئَ بِالْأَسَارَى قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا تَقُولُونَ فِي هَؤُلَاءِ الْأَسَارَى فَذَكَرَ فِي الْحَدِيثِ قِصَّةً، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَنْفَلَتَنَّ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا بِفِدَاءٍ أَوْ ضَرْبِ غُنْتِي، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِلَّا سَهِيلَ ابْنَ بَيْضَاءَ فَإِنِّي قَدْ سَمِعْتُهُ يَذْكُرُ الْإِسْلَامَ قَالَ: فَسَكَتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: فَمَا زَأْنَتِي فِي يَوْمٍ أَخَوْفَ أَنْ تَفْعَ عَلَيَّ حِجَازَةً مِنَ السَّمَاءِ مَتَى فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ، حَتَّى قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِلَّا سَهِيلَ ابْنَ الْبَيْضَاءِ، قَالَ: وَتَزَلَّ الْفُرَّانُ يَقُولُ عَمْرٌ: {مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُشْحَنَ فِي الْأَرْضِ} إِلَى آخِرِ الْآيَاتِ". 30

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے موقع پر قیدیوں کو لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ تم لوگوں کی ان کے متعلق کیا رائے ہے؟ پھر اس حدیث میں طویل قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی فدیہ دیئے بغیر یا گردن دیئے بغیر نہیں چھوٹ سکے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ! سہیل بن بیضاء کے علاوہ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ وہ اسلام کو یاد کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے خود کو اس دن سے زیادہ کسی دن خوف میں مبتلا نہیں دیکھا کہ خواجہ مجھ پر آسمان سے پتھر برسے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سہیل بن بیضاء کے علاوہ پھر حضرت عمر (رض) کی رائے کے مطابق قرآن نازل ہوا (مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُشْحَنَ فِي الْأَرْضِ) 31 "نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خونریزی نہ کر لے ملک میں تم چاہتے ہو اسباب دنیا اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت اور اللہ زور آور ہے حکمت والا ہے۔"

اب دوسری بات یہ ہے کہ کیا یہ مذکورہ حکم منسوخ ہو چکی ہے یا تاحال باقی ہے یعنی جنگی قیدیوں سے فدیہ لینا جائز ہے کہ نہیں اس حوالے سے قاضی ثناء اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "علماء کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ امام المسلمین کا قیدیوں کو قتل کر دینے کا اختیار ہے۔ یہ آیت اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو قتل کر دیا تھا اور نضر بن حارث، طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط کو بھی گرفتاری کے بعد قتل کر دیا تھا۔ قیدیوں کو چھوڑ کر بلا معاوضہ دار الحرب میں بھیج دینا، یا تادان لے کر دار الحرب بھیج دینا، یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کر لینا، یا ذمی بنا کر دار الاسلام میں آزادی کے ساتھ رکھنا، یہ سب شقیں اِثْمًا

بَعْدَ وَاتِّفَاقِ فِدَاءِ أَكْبَرِ الْأَعْيَانِ اور علماء کا ان مسائل میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، سفیان ثوری، اسحاق (بن راہویہ) حسن اور عطا کا قول ہے کہ (مفت) چھوڑ دینا، یا فدیہ لے کر رہا کرنا، یا قیدیوں سے تبادلہ کرنا، سب صورتیں جائز ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اوزاعی، قتادہ اور ضحاک قائل ہیں کہ مفت احسان رکھ کر چھوڑنا ناجائز ہے۔ مالی معاوضہ لے کر رہا کرنے کے متعلق امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ بھی ناجائز ہے لیکن سیر کبیر میں ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں جب کہ مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے نزدیک قیدیوں کا تبادلہ بھی ایک روایت کی رو سے ناجائز ہے۔ صاحب قدوری و ہدایہ نے یہی قول نقل کیا ہے لیکن قوی ترین روایت یہ ہے کہ تبادلہ جائز ہے۔ صاحبین کا بھی قول یہی ہے۔ "32

علامہ ابو بکر جصاص اس مسئلے کے بارے میں اختصار کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں: "اصحاب سیر اور غزوات کے راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے بعد ان سے فدیہ لیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی فدیہ دیے بغیر جانے نہ پائے یا اس کی گردن اتار دی جائے۔ یہ بات اس کی موجب ہے کہ قیدیوں کو پکڑنے اور ان سے فدیہ وصول کرنے کی ممانعت، جس کا ذکر اس آیت (ماکان لنبی ان یکون لہ اسری) میں ہوا ہے اس قول باری (لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب الیم) کی بناء پر منسوخ ہو چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فدیہ لیا تھا۔ "33

اب اگر یہ کہا جائے کہ اس حکم کا منسوخ ہونا کس طرح درست ہو سکتا ہے جب کہ اسی حکم کی خلاف ورزی پر اللہ کی طرف سے ناراضی کا اظہار ہوا تھا۔ ایک ہی چیز میں اباحت اور ممانعت دونوں کا وقوع ممکن ہے، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابو بکر جصاص لکھتے ہیں: "اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ غنائم لینے اور قیدیوں کو پکڑنے کا عمل بنیادی طور پر اس وقت وقوع پذیر ہوا تھا جب اس کی ممانعت تھی، اس لئے جو کچھ انہوں نے لیا تھا اس کے یہ مالک نہیں بنے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی اباحت کردی اور لی ہوئی چیزوں پر ان کی ملکیت کی توثیق کردی اس لئے بعد میں جس عمل کی اباحت کردی گئی تھی وہ اس سے مختلف تھا جس کی پہلے ممانعت کی گئی تھی۔ اس لئے ایک ہی چیز میں اباحت اور ممانعت دونوں کا وقوع لازم نہیں آیا۔ "34

صحابہ کرام قیدیوں کے فدیے لینے پر جو عتاب الہی ہوا اس کی وجہ سے ڈر گئے کہ کئی سال مال غنیمت ہی حرام نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ نہیں ایسا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمہارے لئے فدیہ کے ساتھ دیگر مال غنیمت بھی حلال ہے، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے اس کو بہترین پیرایہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔ "فدیہ لینے پر جب عتاب نازل ہوا تو مسلمان ڈر گئے اور غنائم بدر سے (جن میں فدیہ اساری بھی شامل تھا) ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس کے حلال ہونے میں شبہ ہو گیا اس پر آئندہ آیت نازل ہوئی جس میں ان کی تسلی فرمادی گئی کہ وہ اللہ کی عطا ہے اس کو خوشی سے کھاؤ مال غنیمت فی حد ذاتہ حلال اور طیب ہے اس کے طریق حصول میں

تم سے لغزش ہوئی وہ معاف کر دی گئی اور یہ فدیہ ہم نے تمہارے لیے مباح کر دیا پس جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے جس میں یہ فدیہ بھی شامل ہے اس کو پاک اور حلال سمجھ کر کھاؤ وہ حلال ہے اور بلاشبہ پاک ہے ہمارے عتاب سے اس میں جو کراہت آئی تھی وہ اب ہماری معافی اور اباحت سے زائل ہو گئی اس آیت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی تسلی کر دی کہ یہ حرام نہیں بلکہ بلاشبہ حلال ہے لہذا اس کو خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر کھاؤ اور آئندہ کے لیے احتیاط رکھو اور خدا سے ڈرتے رہو اور مال کی حرص اور طمع سے بچتے رہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔" 35

خلاصہ: خلاصہ کلام اس پورے مضمون کا تین باتیں ہیں پہلی بات یہ کہ جنگ سے فرار ہونے والی جماعت کے بارے میں علماء مفسرین اور فقہاء کرام کے دو مذاہب ہیں ان میں ابو سعید خدریؓ، حسن بصریؓ، ضحاک، قتادہ وغیرہ کا ہے انہوں نے آیت مذکورہ کو جنگ بدر کے ساتھ مخصوص قرار دیکر بھگانا جائز قرار دیا جبکہ دوسرا مذاہب جمہور فقہاء کرام اور علماء کا ہے جن میں آئمہ اربعہ سرفہرست ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر میدان جہاد میں ثابت قدم رہنا واجب ہے اور مقابلہ کفار سے فرار حرام ہے بجز دو صورتوں کے ایک تو یہ کہ پسپائی سے کافروں کو دھوکہ دینا مقصود ہو تاکہ دشمن غافل ہو جائے پھر پلٹ کر دفعۃً اس پر حملہ کرے ظاہر میں بھگانا ہو مگر درحقیقت مقصود حیلہ اور داؤ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ مقصود اصلی بھگانا نہ ہو بلکہ بے سروسامانی کی وجہ سے اپنی مرکزی جامعیت میں پناہ لینا ہو تاکہ ان کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد وقت ال کرے۔ تو ایسی پسپائی گناہ نہیں۔

دوسری بات یہ کہ بوقت تقسیم مال غنیمت کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ یتامی، مساکین اور مسافروں کا ہوگا، جبکہ باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والوں پر عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیے جائیں گے، پیدل مجاہد کے لیے ایک حصہ اور گھڑ سوار کے لیے دو حصے، ایک حصہ اس کے لیے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے ہوں گے۔

تیسری اور آخری بات یہ کہ علماء کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ امام المسلمین کا قیدیوں کو قتل کر دینے کا اختیار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے بنی قریظہ کو قتل کر دیا تھا، اسی طرح قیدیوں کو چھوڑ کر بلا معاوضہ دار الحرب میں بھیج دینا، یا تاوان لے کر دار الحرب بھیج دینا، یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کر لینا، یا ذمی بنا کر دار الاسلام میں آزادی کے ساتھ رکھنا، یہ سب شقیں اِنَّمَا مَنَّا بَعْدُ وَآمَّا فِدَاءُ کی ہیں اور علماء کا ان مسائل میں اختلاف ہے، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، سفیان ثوری، اسحاق (بن راہویہ) حسن اور عطاء کا قول ہے کہ (مفت) چھوڑ دینا، یا فدیہ لے کر رہا کرنا، یا قیدیوں سے تبادلہ کرنا، سب صورتیں جائز ہیں، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، اوزاعی، قتادہ اور ضحاک قائل ہیں کہ مفت احسان رکھ کر چھوڑنا ناجائز ہے۔ مالی معاوضہ لے کر رہا کرنے میں کوئی حرج نہیں

جب کہ مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے نزدیک قیدیوں کا تبادلہ بھی ایک روایت کی رو سے ناجائز ہے۔ صاحب قدوری و ہدایہ نے یہی قول نقل کیا ہے لیکن قوی ترین روایت یہ ہے کہ تبادلہ جائز ہے۔ صاحبین کا بھی قول یہی ہے۔

حوالہ جات

1. حریری، غلام محمد، تاریخ تفسیر و مفسرین، فیصل آباد: ملک سنز اینڈ پبلشرز، 1999ء، ص: 229
2. السیوطی، جلال الدین، کتاب التحدیث، نعمۃ اللہ، قاہرہ: المطبعۃ العربیۃ الحدیثیہ، 1975ء، ص: 79
3. اردودائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور: 2006ء، ج: 11، ص: 537
4. غازی، محمود احمد، محاضرات قرآنی، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران، 2002ء، ص: 237
5. چشتی، مولوی، عبدالحلیم، فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ، لاہور: علمی بک ڈپو، سن اشاعت ندارد، ص: 212
6. سیوطی، جلال الدین، عبدالحمان، مقدمہ الاقناف فی علوم القرآن، کوئٹہ، مکتبہ المعروفی، سن اشاعت، ج: 2، ص: 183
7. سیوطی، جلال الدین، عبدالحمان، مقدمہ الاکلیل فی استنباط التزیل، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1981ء، ص: 5
8. القرآن، سورہ الانفال: 8: 15
9. سیوطی، جلال الدین، عبدالحمان، الاکلیل فی استنباط التزیل، ص: 134
10. بخاری محمد بن اسماعیل، (سنن) الصحیح لامام بخاری، کتاب الحدود، باب رمی الحصنات، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ج: 2، ص: 1003
11. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ: سن، ج: 4، ص: 37
12. ازہری، پیر کرم شاہ، (سنن) ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور: ج: 2، ص: 132
13. طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تائید القرآن، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 1420ھ-2000ء، ج: 13، ص: 436
14. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج: 4، ص: 37
15. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج: 4، ص: 38
16. القرآن، سورہ الانفال: 9: 41
17. سیوطی، جلال الدین، عبدالحمان، الاکلیل فی استنباط التزیل، ص: 135
18. اصفہانی، امام راغب محمد بن حسین، مفردات القرآن، میر محمد کتب خانہ، کراچی: سن، ص: 324
19. محمد عظیم الاحسان، التعریفات الفقہیۃ، دارالکتب العلمیۃ، 1424ھ-2003ء، ج: 1، ص: 165
20. اصفہانی، امام راغب محمد بن حسین، مفردات القرآن، ص: 324
21. تھانوی، محمد بن علی، موسوعۃ کشف اصطلاحات الفنون والعلوم، مکتبۃ لبنان، بیروت، 1996ء، ج: 2، ص: 1293
22. محمد عظیم الاحسان، التعریفات الفقہیۃ، ج: 1، ص: 165

23. طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تائید القرآن، ج: 4، ص: 243
24. عثمانی، شبیر احمد، تفسیر عثمانی المعروف فوائد القرآن، دارالاشاعت، کراچی: 2007، ج: 1، ص: 821
25. امام قدوری، ابوالحسنین احمد بن محمد، مختصر القدوری، کراچی: امیر محمد کتب خانہ، سن، ص: 232
26. مرغنائی، علی بن ابی بکر، (سن) (سن) (سن). الہدایہ. کونستہ: مکتبہ رشیدیہ، ج: 4، ص: 324
27. امام قدوری، ابوالحسنین احمد بن محمد، مختصر القدوری، ص: 232
28. القرآن، سورہ الانفال: 8: 57
29. سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمان، الاکلیل فی استنباط التزیل، ص: 136
30. ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، (سن) جامع الترمذی، قدیمی کتب خانہ، کراچی کتب التفسیر، باب ومن سورۃ الانفال، ج: 2، ص: 149
31. القرآن، سورہ الانفال: 8: 67
32. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج: 4، ص: 41
33. طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تائید القرآن، ج: 4، ص: 257
34. طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تائید القرآن، ج: 4، ص: 257
35. کاندہلوی، مولانا محمد ادریس، معارف القرآن، مکتبہ عثمانیہ، لاہور: 2002، ج: 3، ص: 141

THE NEED FOR RECONCILIATION AND ITS UTILITY IN CONTEMPORARY TIMES

صلح کی ضرورت و اہمیت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت

* مشتاق احمد بادی بنی اسکالر ایم فل علوم اسلامیہ جامعہ بلوچستان کوئٹہ۔

** طاہرہ فردوس لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ بلوچستان، کوئٹہ۔

Abstract: Islam is the religion of peace. Over billions of people around the world are followers of Islam. There can be no greater argument supporting Islam as a religion of peace than the name of the religion itself. 'Islam' literally means peace, therefore, it seems quite unnatural that a religion that names itself peace can teach or preach something that is violent or full of aggression. Allah Almighty in Quran has encouraged the establishment of peace and has told the followers of Islam to be moderate in their behavior and adopt the qualities of kindness, love, and respect for others. There are so many Hadith on the importance of peace in Islam that we will discuss in this article. The root of the word Islam is "silm", refers to "making peace", being in a mutually peaceful environment, finding peace, reaching salvation and well-being or being far from danger, attaining goodness, comfort and favor, keeping away from troubles and disasters, submitting the self and obeying, respect, being far from wrong. Islam is a peaceful religion. It stands for peace and desires peace. The basis of Islam is peace. Islam wants peace for its followers and all the other residents of the world. A true Muslim is the one who truly follows Islam, someone who is at perfect peace, with himself and with others. As our beloved Prophet Muhammad (ﷺ) said, mentioned in the Hadith collections of Tirmidhi and Nasai: "A true believer (mumin) is he from whom people's lives and wealth are safe." Allah wants a Muslim to live in a safe and peaceful environment and to make efforts for the spread and continuity of peace in society for him and for all others. Muslims should respect others and try to maintain peace and should follow the straight path. Our beloved Prophet Muhammad (ﷺ) was sent as nothing but mercy to all the mankind. If the bringer of a religion is nothing but mercy and in His Brought Truth, there is no compulsion then the impression that Islam promotes violence seems illogical. Thus, Islam in its true preaching is nothing but peace.

Keywords: Reconciliation, Need of Reconciliation, Reconciliation in the modern world.

اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے جو اعمال محبوب اور جو کام پسند ہیں، ان میں سے ایک ”صلح و مصالحت“ ہے۔ ادیان عالم میں صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر مکمل رہنمائی فرماتا ہے، ذاتی و انفرادی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے اجتماعی زندگی کی تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں کو سلجھاتا ہے، اس کا موثر اور آسان حل بھی پیش کرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کا فائدہ محض فانی دنیا تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ ہمیشہ کی کامیابی و کامرانی کے حصول تک مقرر کرتا ہے۔

چونکہ ہر انسان کا مزاج اور طبیعت دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اس لیے اکٹھے رہن سہن، لین دین، اور باہمی معاملات و

تعلقات میں بسا اوقات دوسرے کی خلاف مزاج باتوں سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں بڑھتے بڑھتے نفرت و عداوت، قطع کلامی و قطعی تعلقی، دشمنی و لڑائی، جھگڑے، جنگ و جدال، خون خرابے، اور قتل و غارت تک جا پہنچتی ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ کا امن غارت ہو جاتا ہے، اور فساد شروع ہو جاتا ہے، انسانی نظام زندگی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ خاندانوں کے خاندان اس کے بھینٹ چڑ کر اجڑ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس جہان رنگ و بو میں فتنہ و فساد کو پسند نہیں فرماتے ہیں، چنانچہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾^(۱) ”اور زمین میں اُس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔“

ایک اور مقام میں ہے: ﴿.....وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾^(۲) ”اور زمین میں اُس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔ لوگو! یہی طریقہ تمہارے لیے بھلائی کا ہے، اگر تم میری بات مان لو۔“

ایک اور آیت کریمہ میں فتنہ و فساد پھیلانے والوں سے اپنی نفرت کا اظہار یوں فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾^(۳) ”اور زمین خدا میں فساد نہ ڈھونڈنا، تحقیق اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں۔“

فتنہ و فساد تب رونما ہوتا ہے جب آپس میں دوریاں واقع ہوں اور ان کے ازالے کے لیے سنجیدہ کوشش و سعی نہ کی جائے تو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مزید گہری سے گہری ہوتی چلی جاتی ہیں جو بالآخر قتل و خون ریزی، عصمت دری جیسے شنیع و قبیح امور پر منتج ہو جاتی ہیں۔ اسلام جو کہ ادیان سماویہ کی آخری کڑی ہے، نے فتنہ و فساد کی بیج کنی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا ہے اور اس کے لیے ترغیباً و ترہیباً پہلو کو اختیار کیا ہے۔ فتنہ و فساد اور ظلم و زیادتی کے ختم کرنے کا ایک طریقہ ”عدالتی“ ہے جس میں عدالت کے ذریعہ معاشرہ میں پائے جانے والے فتنہ و فساد اور جور و عدوان کی قلع قمع کی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ ”مصالحت و وثاقتی“ ہے جس میں معاشرہ کے با اثر طبقہ چاہے وہ امیر و کبیر ہوں یا علمائے و صلحائے، کے ذریعہ باشندگان ملک میں پائی جانے والی دوریوں کو اور خلیج کو پانا جاتا ہے غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ یہ دوسرا طریقہ ”مصالحت و وثاقتی“ پہلے طریقہ ”عدالتی“ سے کئی گنا افضل و بہتر ہے اور اس کے اثرات زود اثر اور دیر پا ہیں، اس لیے اسلام جو کہ دین فطرت ہے، نے مصالحت و وثاقتی کو مشروع کیا ہے تاکہ معاشرہ میں پائی جانے والی دوریاں کی وسیع خلیج کو پانا جاسکے اور منافرت کو مودت سے تبدیل کیا جاسکے۔ شیطان انسان کا زلی دشمن ہے^(۴) اور اس کی کوشش رہتی ہے کہ انسانوں کے مابین نفرت و دشمنی کا بیج بوئے اور ان کو باہم جنگ و جدل میں سرسپیکار رکھے۔^(۵)

جب دو مسلمانوں میں نفرت پھوٹ پڑے تو اولاً ان کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ خود آپس میں صلح صفائی کر لیں، معاملہ کو مزید

آگے بڑھنے نہ دیں کیونکہ ایک مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض ہونا شرعاً درست نہیں ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے ” : لایحل لمسلم ان یہجر اخاہ فوق ثلاث ، فمن ہجر فوق ثلاث فمات دخل النار“۔⁽⁶⁾

”کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی کرے۔ جس شخص نے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی رکھا اور (اس دوران) مر گیا تو جہنم میں جائے گا۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ مسلمان سے قطع تعلقی رکھنا اس کو قتل کرنے کے مترادف ہے ” : عن ابی خراش السلمیؓ ”انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول: من ہجر اخاہ سنۃ ، فہو کسفک دمہ“۔⁽⁷⁾

”حضرت ابو خراش سلمیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے (ناراضگی کی وجہ سے) اپنے مسلمان بھائی سے ایک سال تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا، گویا اس نے اس کا خون کیا (یعنی سال بھر قطع تعلقی کا گناہ اور ناحق قتل کرنے کا گناہ قریب قریب ہیں)۔“

لہذا ہر مسلمان کا فرض منصبی ہے کہ وہ ایسی صورت میں قطع تعلقی کو ختم کرنے کے لیے خود پہل کرے۔ کیونکہ حدیث کریم میں پہل کرنے والے کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے،

چنانچہ ایک حدیث میں ہے ” : لا یحل لمسلم ان یہجر اخاہ فوق ثلاث لیل ، یلتقیان فیعرض هذا ویعرض هذا ، وخیر ہما الذی یدأ بالسلام“،⁽⁸⁾ ”کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین رات سے زیادہ اس طرح قطع تعلقی رکھے کہ دونوں ملیں تو یہ ادھر کو منہ پھیرے اور وہ ادھر کو منہ پھیرے اور دونوں میں افضل وہ ہے جو قطع تعلقی کو ختم کرنے کے لیے سلام علیک سلیک میں پہل کرے۔“

اگر وہ خود آپس میں صلح نہ کر لیں تو ثنائی پوری امت محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان میں صلح کے لیے کوششیں کریں اور ایسی صورت میں خاموش بن کر نہ بیٹھیں، بلکہ ان میں لگ ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہر شخص اپنے بساط کے مطابق تگ و دو د کرے۔ اسلام میں مصالحت و ثالثی کو بہت بڑی فضیلت و اہمیت حاصل ہے اور اس میں اس کی ترغیب کئی پیاریوں میں دی گئی ہے۔ ذیل میں ہم نکات کی شکل میں ان کو بیان کرتے ہیں :

1- صلح بہتر ہے

قرآن کریم میں ایک مقام پر ”صلح“ کے لیے اسم تفضیل کا صیغہ استعمال ہوا ہے : ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾⁽⁹⁾ ”یعنی: صلح دیگر طرق و ذرائع سے بہتر و اولیٰ ہے۔“

اور یہ معلوم ہے کہ عربی زبان میں اسم تفضیل کا صیغہ غیر کی بنسبت افضلیت کے لیے آتا ہے تو معلوم ہوا کہ صلح کا نظام دوسرے نظاموں سے بہتر و افضل ہے۔ قرآن مجید میں بصیغہ امر ”صلح“ کا حکم دیا گیا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ﴾ ”مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے بھائیو! میں صلح کرایا کرو۔“

ایک اور مقام میں ہے: ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاتَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾⁽¹¹⁾

”اگر مومنوں کی دو جماعتوں میں لڑائی ہو جائے تو ان میں صلح کرا دو، اگر ان میں سے ایک دوسری پر تجاوز کرے تو جو جماعت تجاوز کرے، اس سے لڑو یہاں تک اللہ کے امر کے آگے جھکے، اگر جھکے تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو، انصاف کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتے ہیں۔“

ایک اور آیت کریمہ میں ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلَحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾⁽¹²⁾ (اے پیغمبر ﷺ) لوگ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ مال غنیمت (کے بارے میں فیصلے) کا اختیار اللہ اور رسول کو حاصل ہے، لہذا تم اللہ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات درست کر لو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر واقعی تم مومن ہو۔

اور اصول فقہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ امر مطلق عن القرائن وجوب ہی کے لیے ہے تو معلوم ہوا کہ مسلمان بھائیوں کے مابین صلح کرنا لازم و ضروری ہے۔⁽¹³⁾

2- صلح کرنا صدقہ ہے

لوگوں میں صلح کرنا ایک قسم کا صدقہ ہے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے ”کل سلامی من الناس علیہ صدقة، کل يوم تطلع فيه الشمس يعدل بين الاثنين صدقة“۔⁽¹⁴⁾ ”انسان کے ہر ایک جوڑ پر صدقہ ہے، جب سورج طلوع ہوتا ہے، دو انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرنا صدقہ ہے۔“

قرآن کریم میں ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نُّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾⁽¹⁵⁾

”لوگوں کی بہت سی خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی الا یہ کہ کوئی شخص صدقے کا یا کسی نیکی کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے۔“

3۔ صلح افضل ترین صدقہ ہے

صلح کرانا نہ صرف ایک قسم کا صدقہ ہے، بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ”افضل ترین صدقہ“ ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أَفْضَلَ الصَّدَقَةِ إِصْلَاحَ ذَاتِ الْبَيْنِ“۔⁽¹⁶⁾ ”عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”سب سے افضل صدقہ آپس میں صلح کرانا ہے۔“

4۔ صلح نفلی نماز، نفلی روزہ اور نفلی صدقہ سے افضل ہے

صلح نہ صرف افضل ترین صدقہ ہے، بلکہ اس کا درجہ روزہ، نماز اور صدقہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ ”الا اخبرکم بافضل من درجة الصيام والقيام والصدقة والصلاة؟ قالوا: بلى يا رسول الله، قال: اصلاح ذات البين، وان فساد ذات البين هي الحالقة“،⁽¹⁷⁾ ”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتا دوں جس کے ثواب کا درجہ روزے، نماز اور صدقہ کے ثواب سے زیادہ ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپس میں دشمنی رکھنے والے دو اشخاص کے مابین صلح کرانا۔ دو آدمیوں میں فساد ڈالنا ایک ایسی خصلت و عادت ہے جو مونڈنے والی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ سر کے بالوں کو نہیں مونڈتی، بلکہ انسان کے دین کو مونڈ ڈالتی ہے۔“⁽¹⁸⁾

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ”حدیث پاک میں صلح کرانے کو جو روزہ، صدقہ اور نماز سے افضل کہا گیا ہے، یہاں فرض نماز، فرض روزہ اور فرض صدقہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد نفلی روزہ، نفلی نماز اور نفلی صدقہ ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقی مراد کیا ہے؟؛ لیکن اگر دو فریقوں کے درمیان پائی جانے والی دشمنی و عداوت کو ختم کرانا اور دونوں کے درمیان صلح صفائی کرنا مذکورہ فرض عبادات سے بھی افضل ہو تو بجا ہے، کیونکہ اول تو وہ عبادات ایسی ہیں کہ اگر قضائی ہو جائیں تو ان کی قضائی کی وجہ سے ان کا تدارک ممکن ہے، جب عداوت و دشمنی کے نتیجے میں ہلاک و برباد ہونے والی جانوں کے ضیاع کا تدارک ممکن نہیں، دوسرے یہ کہ ان عبادات کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اور مذکورہ ہلاکت و تباہی کا تعلق حقوق العباد سے ہے، حقوق اللہ کے مقابلے میں حقوق العباد کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ کہنا زیادہ موزون ہے کہ اس عمل (صلح) کی جنس، ان عبادات کی جنس سے افضل ہے۔“⁽¹⁹⁾

البشیر والنذیر میں ہے: ”اور مولانا محمد عاشق الہی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہر قسم کی قومی اور ملکی بہبودی جو کہ متعدی نفع ہے، چونکہ باہمی اتفاق پر موقوف ہے، لہذا عبادت کے لازمی نفع سے مقدم ہے.....“۔⁽²⁰⁾

ایک اور روایت میں ہے ”ما عمل ابن آدم شیئاً افضل من الصلاة ، وصلاح ذات البین ، وخلق حسن“،⁽²¹⁾ ”ابن آدم کے افعال میں سے افضل ترین عمل نماز، صلح کرنا اور اچھا اخلاق ہے۔“

5۔ صلح اللہ اور اس کے رسول کا پسندیدہ عمل ہے

صلح وہ عمل ہے جس سے اللہ اور اس کے حبیب راضی ہوتے ہیں، چنانچہ مروی ہے کہ آپ نے حضرت ابویوب انصاریؓ سے فرمایا: ”یا ابا ایوب الا ادلک علی عمل یرضاه اللہ ورسولہ ؟ قال : بلی قال : تصلح بین الناس اذا تفاسدوا وتقارب بینہم اذا تباعدوا“⁽²²⁾

”اے ابویوب! کیا میں آپ کو کوئی ایسا عمل نہ بتاؤں جس سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوتے ہیں؟ ابویوب نے کہا ضرور بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگوں میں فساد پھوٹ پڑے تو ان میں صلح کر دینا، جب ان میں دوریاں واقع ہونے لگیں تو ان میں قربتیں اور نزدیکی پیدا کرنا۔“

نہ صرف پسندیدہ عمل ہے، بلکہ امام اوزاعیؒ کے بقول ”اللہ کے ہاں محبوب ترین عمل ہے“: قال الاوزاعی: ما خطوة احب الی اللہ عز وجل من خطوة فی اصلاح ذات البین“⁽²³⁾ ”اللہ کے ہاں اس قدم سے بڑھ کوئی قدم نہیں ہے جو قدم لوگوں میں صلح کرانے کے لیے اٹھے۔“

6۔ صلح کرانے والے کو لیلیۃ القدر پانے والے کی بقدر ثواب ملتا ہے

حدیث مبارکہ ہے ”: وَمَنْ مَشَىٰ فِي صَلْحٍ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَلَّاتٍ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ حَتَّىٰ يَرْجِعَ ، وَأُعْطِيَ أَجْرَ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ، وَمَنْ مَشَىٰ فِي قَطِيعَةٍ بَيْنَ اثْنَيْنِ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْوِزْرِ بِقَدْرِ مَا أُعْطِيَ مَنْ أَصْلَحَ بَيْنَ اثْنَيْنِ مِنَ الْأَجْرِ ، وَوَجِبَتْ عَلَيْهِ اللَّعْنَةُ حَتَّىٰ يَدْخُلَ جَهَنَّمَ ، فَيُضَاعَفُ عَلَيْهِ الْعَذَابُ“⁽²⁴⁾ ”جو شخص دو اشخاص میں صلح کرانے کے لیے نکلے، اس کے لیے اس وقت تک فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں جب تک وہ واپس آجائے۔ اور اس کو لیلیۃ القدر کی بقدر ثواب دیا جاتا ہے۔ جو شخص لوگوں میں قطع تعلقی کے لیے محنت کرے، اس کو اتنا گناہ ملتا ہے، جتنا ثواب صلح کرانے والے کو ملتا ہے، اس پر جہنم داخل ہونے تک لعنت و پھٹکارا ترتی رہے گی اور اس کا عذاب دوچند کیا جائے گا۔“

7۔ صلح کرانے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے

محمد بن کعب قرظی سے مروی ہے کہ لوگوں کے مابین صلح کرانے والا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے، چنانچہ ”مداراة الناس“ میں ہے: ”عن محمد بن کعب القرظی۔ رضی اللہ عنہ۔ قال: من اصلح بین قوم فهو كالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“⁽²⁵⁾ ”محمد بن کعب قرظی سے منقول ہے کہ لوگوں کے مابین صلح کرانے والا راہِ خدا میں

جہاد کرنے والے کی طرح ہے یعنی جس طرح مجاہد اللہ کی زمین کو کفار کی نجاستوں سے پاک کرنے کی سعی کرتا ہے، بالکل اسی طرح صلح کرانے والا بھی زمین کو فتنہ و فساد کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنے میں لگا رہتا ہے۔“

8۔ صلح کرانا غلام آزاد کرنے کی مانند ہے

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں کے مابین صلح کرانا غلام آزاد کرنے کے مترادف ہے ”: من اصلح بین الناس اصلح الله امره واعطاه بكل كلمة تكلم بها عتق رقبة ورجع مغفوراً له ما تقدم من ذنبه ، رواه الاصبهانی وهو حدیث غریب جداً“، (26)

”جو شخص لوگوں میں صلح کرائے، اللہ تعالیٰ اس کا معاملہ درست فرمائیں گے اور اس کو ہر کلمہ کے عوض ایک غلام آزاد کرنے کا اجر دیں گے، اور وہ شخص اس حال میں واپس لوٹے گا کہ اس کے سابقہ گناہ معاف ہوں گے۔ اس کو علامہ اصبہانی نے روایت کی ہے اور یہ حدیث غریب ہے۔“

9۔ صلح کرانا جہنم سے خلاصی کا ذریعہ ہے

امام اوزاعیؒ کا قول ہے کہ لوگوں میں صلح کرانا جہنم کی آگ سے خلاصی کا باعث ہے، چنانچہ ”تفسیر قرطبی“ میں ہے ”: قال الاوزاعی: ومن اصلح بین اثنين ، كتب الله له برائة من النار“، (27) ”جو شخص دو آدمیوں میں صلح کرادے، اللہ اس کے لیے جہنم سے خلاصی کا پروانہ لکھ دیتے ہیں۔“

10۔ صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے

صلح کرانے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولنا جو کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے، بھی جائز ہے، چنانچہ ام کلثومؓ سے مروی ہے : وعن ام كلثوم - رضى الله عنها - قالت: سمعت رسول الله يقول: ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس، فينمي خيراً او يقول خيراً“، (28)

”ام کلثومؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو باہم لڑنے والے آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے اور اس سلسلہ میں ایک فریق کی طرف دوسرے فریق کو خیر اور بھلائی کی باتیں پہنچائے اور اچھا اثر ڈالنے والی اچھی باتیں کرے۔“

مسلم شریف کی روایت میں ہے : ”قال ابن شهاب: ولم اسمعه يرخص في شيء مما يقول الناس كذب الا في ثلاث: الحرب، والاصلاح بين الناس، وحديث الرجل امراته وحديث المرأة زوجها“، (29) ”ابن شہاب نے فرمایا کہ آپ ﷺ سوائے ان تین کے باقی باتوں میں جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دیتے تھے : (1) لڑائی میں (2) صلح کرانے کے لیے اور (3) شوہر کا بیوی کو اور بیوی کا شوہر کو خوش کرنے کے لیے۔“

ابن بابویہؒ فرماتے ہیں: ”ان الله احب الكذب في الاصلاح، وابغض الصدق في الافساد“ (30) ”اللہ تعالیٰ نے صلح کرانے کے لیے جھوٹ کو مباح قرار دیا ہے اور فساد ڈالنے کے لیے سچ کو ناپسند کیا ہے۔“

اسی کو شیخ سعدیؒ نے فارسی میں اس طرح بیان کیا ہے دروغ مصلحت آمیز بہہ از راستی فتنہ انگیز، (31) ایسا جھوٹ جس کے ذریعہ دو مسلمانوں کے درمیان مصالحت مقصود ہو، اس سچ سے بہتر ہے جس سچ سے فتنہ پیدا ہو۔ واضح رہے کہ صلح کرانے میں جس جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی گول مول بات (توریہ) کی جائے جس کا ظاہری مفہوم تو واقعہ کے خلاف ہو، لیکن دل میں ایسا معنی مراد لیا جائے جو واقعہ کے مطابق ہے۔ (32)

صلح کی اسی اہمیت و افادیت کی وجہ سے آپ ﷺ صلح کی ترغیت دیتے تھے اور صلح کے لیے تشریف لے جاتے تھے، چنانچہ جب آپ ﷺ کو خبر دی گئی کہ اہل قبائے میں اختلاف ہو گیا ہے اور وہ ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے ہیں تو آپ ﷺ اپنے اصحاب کو لیکر ان کے ہاں تشریف لے گئے یہاں تک کہ جماعت میں تاخیر ہو گئی، لیکن آپ ﷺ اس تاخیر کو برداشت کیا، ان میں اختلاف و تفرقہ کو برداشت نہیں کیا: ”عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ أَهْلَ قُبَائٍ اقْتَتَلُوا حَتَّى تَرَامُوا بِالْحِجَارَةِ فَأَخْبَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ فَقَالَ: اذْهَبُوا بِنَا نُصْلِحْ بَيْنَهُمْ“ (33) ”سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ اہل قبائے میں لڑائی ہوئی ہے، انہوں نے ایک دوسرے کو پتھروں سے مارا ہے، آپ ﷺ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ چلو ان کے درمیان صلح کراتے ہیں۔“

شرح الربیعین نوویہ میں ہے: ”قال انس: ”من اصلح بين اثنين اعطاه الله بكل كلمة عتق رقبة، وقال ابو امامة: امش ميلاً وعد مريضاً، وامش ميلين وزر اخاً في الله، وامش ثلاثة اميال واصلح بين اثنين“ وقال بعض العلماء: من اراد فضل العابدين فليصلح بين الناس، ولا يوقع بينهم العداوة والبغضاء“ (34) ”جو دو افراد میں صلح کرائے، اللہ تعالیٰ اس کو ہر کلمہ کے مقابلے میں ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب عنایت فرمائیں گے۔ ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ مریض کی عیادت کے لیے ایک میل دور چل، بھائی کی ملاقات کے لیے دو میل مسافت سفر کرنے کی زحمت برداشت کر، لوگوں میں صلح کرانے کے لیے تین میل کے سفر کی مشقت برداشت کر (یعنی صلح کی اہمیت ان سے زیادہ ہے)۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جو شخص عابدین (عبادت گزار بندوں) کی فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ لوگوں میں صلح کرائے، ان میں بغض و عداوت نہ ڈالے (یعنی اس طرح کرنے سے وہ عابدین کے درجہ کو پاسکے گا)

جب مسلمانوں میں عداوت و دشمنی پیدا ہو جائے تو دوسروں کو خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھنا چاہیے، بلکہ ان میں صلح کرانے کی تگ و دو د کرنی چاہیے۔ عداوت و دشمنی کی صورت میں خاموش تماشائی بننے کو ”اقوام سابقہ“ کی بیماری کہا گیا ہے: ”يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: انه سيصيب امتي داء الامم قالوا: يا نبي الله

وما دای الامم ؟ قال : الاشر والبطر والتکائر والتناجش فی الدنیا والتباغض والتحاسد حتی یکون البغی ثم یکون الهرج۔“ (35) ”ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو کہتے ہوئے سنا کہ میری امت کو بھی سابقہ امتوں کی بیماری لگ جائے گی، لوگوں نے کہا کہ سابقہ امتوں کی بیماری کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کفران نعمت (ناشکری) تکبر، مال کو کثیر مقدار میں جمع کرنا، دنیا میں رغبت، بغض و حسد یہاں تک کہ حد سے بڑھ جائے گا پھر ہرج نمودار ہوگا۔“

11- صلح نہ کرنے والے کی بخشش و مغفرت نہیں ہوتی ہے

ایک حدیث میں ہے کہ ایک دوسرے سے بغض و عناد رکھنے والے کی بخشش نہیں ہوتی ہے: ”عن ابی ہریرۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصوم الاثنین والخمیس فقیل یا رسول اللہ انک تصوم الاثنین والخمیس فقال: ان یوم الاثنین والخمیس یغفر اللہ فیہ ما لکل مسلم الا متہاجرین۔ یقول: دعہما حتی یصلحا،“ (36) ”حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے تو آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ پیر اور جمعرات کو کیوں روزہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پیر اور جمعرات کو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی بخشش فرماتے ہیں سوائے ان کے جو آپس میں ناراض ہیں۔ فرماتے ہیں ان کو چھوڑ دیں تاکہ آپس میں صلح کر لیں۔“

ان احادیث طیبہ اور اقوال سلف سے معلوم ہوا کہ ”مصالحت و ثالثی“ باہمی کینہ و حسد، ذاتی دشمنیوں کے ازالہ کا باعث ہے اور زود اثر اور دیر پا فائدہ کا حامل ہے، اس لیے فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں میں صلح کرنا مستحب و مندوب اور مستحسن و محمود عمل ہے اور حکام وقت کو مسلمانوں کو صلح کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمر فاروقؓ جیسے زیرک حکمران فرماتے تھے کہ: ”ردو الخصوم حتی یصلحوا فان فعل القضاء یحدث بین القوم الضغائن،“ (37) ”خصوم (نزاع کرنے والوں) کو واپس کر دو تاکہ وہ آپس میں صلح کر لیا کریں کیونکہ فیصلہ سے ان میں کینہ پیدا ہوتا ہے (جو کسی بھی وقت شعلہ جوالہ بن کر نکلے گا اور معاشرہ کے امن و امان کو بھسم کر کے رکھ دے گا)

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کا ایک اور فرمان ہے: ”ردو الخصوم اذا کانت بینہم قرابۃ فان فصل القضاء یورث بینہم الشنآن،“ (37) ”نزاع کرنے والے جب رشتہ دار ہوں تو ان میں فیصلہ کیے بغیر ان کو چھوڑ دو (شاید وہ صلح کرنے پر رضامند ہو جائیں) کیونکہ فیصلہ کرنے سے ان میں دشمنیاں جنم لیں گی (جو کسی بھی قیمت پر معاشرہ کے لیے مفید و نافع نہیں)۔“

اس لیے فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ اگر فریقین میں صلح کرنے کی امید ہو تو فیصلہ میں تاخیر کی گنجائش ہے۔ علامہ حنفیؒ لکھتے ہیں: ”وَفِی الْأَشْبَاهِ: لَا یَجُوزُ لِلْقَاضِیِ تَأْخِیرُ الْحُكْمِ بَعْدَ وُجُودِ شَرَائِطِهِ إِلَّا فِی ثَلَاثٍ: لِرَبِیْبَةٍ، وَلِرَجَائِ صَلَاحِ

أَقَارِبَ وَإِذَا اسْتَمْعَلُ الْمُذْعَى“۔⁽³⁸⁾ ”الاشباہ والنظائر میں ہے کہ شرائط کے پائے جانے کے بعد قاضی کے لیے فیصلہ میں تاخیر کرنا ناجائز ہے، مگر تین جگہیں ایسی ہیں کہ ان میں تاخیر جائز ہے: (۱) شک و شبہ کی صورت میں (۲) عزیز و اقارب میں صلح کی امید کے

پیش نظر (۳) مدعی جب مہلت مانگنے کی استدعا کرے۔“

الغرض مسلمانوں کے مابین صلح کرنا بہت فضیلت والا عمل ہے۔ مکارم اخلاق جتنے بھی ہیں، اگر ان کا خلاصہ، نچوڑ اور لب لباب نکالا جائے تو وہ یہ دو ہوں گے: (۱) اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکریم اور (۲) لوگوں میں صلح کرانا۔ چنانچہ ”موارد الزمان“ میں ہے: ”ان المکارم کلها لو حصلت رجعت جملتها الى شئین تعظیم امر الله جل جلاله والسعی فی اصلاح ذات البین“،⁽³⁸⁾ ”مکارم اخلاق کی بنیادیں دو چیزیں ہیں (۱) اللہ کی تعظیم و تکریم اور (۲) لوگوں میں صلح کرانے کے لیے سعی و کوشش کرنا۔“

صلح کے فوائد و برکات

صلح کے اتنی فضیلت و اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کے کئی فوائد و برکات بھی ہیں جن میں سے چند چیدہ چیدہ فوائد و برکات یہ ہیں :

- (۱) صلح سے فریقین میں نفرت کی جگہ محبت پیدا ہوتی ہے۔
- (۲) نزاع کے درخت کے تناور ہونے سے پہلے جڑ کٹتی ہے۔
- (۳) صلح کے بدولت فریقین میں خون ریزی کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔
- (۴) کیس و کیس کشی کے خرچوں سے حفاظت ہوتی ہے۔
- (۵) خصومت و نفرت کی وجہ سے جن حقائق کا انکار کرنا ہی پکڑتا ہے، ان سے حفاظت ہوتی ہے۔
- (۶) حقوق تلفی سے بچا جاسکتا ہے جس سے باہم نفرت کرنے والے بہت ہی کم بچتے ہیں۔
- (۷) دلوں میں مصالحہ کنندہ کے لیے محبت و الفت کے جذبات ابھرتے ہیں۔
- (۸) صلح کرانے اور صلح کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت نزول ہوتی ہے۔

(9) وقت کا ضیاع نہیں ہوتا ہے۔⁽³⁹⁾

آداب مصلح (صلح کنندہ)

صلح کے بار آور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مصلح (صلح کنندہ) ان آداب سے متصف ہو:

1- مصلح کی نیت درست ہو، اپنے اس عمل سے اللہ کی خوشنودی کا قصد کرے، جیسا کہ قرآن میں ہے ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾⁽⁴⁰⁾ ”اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے۔“

2- صلح کراتے وقت عدل و انصاف سے کام لے لے، ظلم و زیادتی سے بچا رہے۔ ﴿فَاصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾⁽⁴¹⁾ ”تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرادو، انصاف کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتے ہیں۔“

3- صلح کرانے کے لیے ضروری ہے کہ حالات کا بخوبی جائزہ لے، ہر ایک کی بات غور سے سنے، اگر ضرورت پڑے تو علماء و صلحاء سے مشاورت سے بھی نہ ہچکچائے۔

4- صلح کراتے وقت جلد بازی نہ کرے، کیونکہ جلد بازی سے معاملہ مزید بگڑ جاتا ہے۔

5- صلح کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرے۔ جھگڑا ہوتے ہی صلح کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ ان کا جوش و جذبہ ٹھنڈا ہو جائے اور دماغ ٹھکانے پر آجائے۔

6- سب سے اہم بات یہ ہے کہ الفاظ کے استعمال میں خیال برتے، ان کو ان کی نیکیاں یاد دلانے اور باہم نفرت و دشمنی کی ہولناکیوں اور نقائص سے آگاہ کیا جائے یعنی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اس کو صلح کرانے پر آمادہ کرے، مثلاً یہ حدیث بیان کرنا کہ ”باہم نفرت و دشمنی انسان کے دین و اخلاق کو تباہ و برباد کر دیتی ہے، اور یہ کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض ہونا جائز نہیں ہے اور یہ کہ ان میں سے جو پہل کرے، وہ افضل ہے، وغیرہ وغیرہ۔“⁽⁴²⁾

حواشی و حوالہ جات

1. الاعراف 56:7-

2. الاعراف 85:7-

3. القصص 77:28-

4. یوسف 5:12۔
5. المائدہ 91:5۔
6. السجستانی، ابوداؤد سلیمان بن اشعث، السنن: ۴/279، کتاب الادب، باب فین یحجرہ اخاہ المسلم، رقم حدیث: ۴۱۹۴، المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت۔
7. ایضاً۔
8. النیشاپوری، مسلم بن حجاج، الصحیح: ۴/1984، کتاب البر والصلوٰۃ والادب، باب تحريم الحجر فوق ثلاث، رقم حدیث: 2560، دار احیاء التراث العربی۔
9. النساء 4:128۔
10. الحجرات 49:10۔
11. الحجرات 49:9۔
12. الانفال 8:1۔
13. الاخشیکشی، حسام الدین محمد بن محمد عمر، منتخب الحسامی، ص: ۴۷، فصل فی الامر۔ المکتبۃ البشری، کراچی، سن اشاعت: 1436ھ۔
14. البخاری، محمد بن اسماعیل، الصحیح: ۳/187، کتاب الصلح، باب فضل الاصلاح بین الناس والعدل بینهم، رقم حدیث: 2707، دار طوق النجاة، مصر، الطبعة الاولى: 1422ھ۔
15. النساء 4:114۔
16. القضاء، ابو عبد اللہ محمد بن سلامہ بن جعفر، مسند الشهاب: ۲/244، رقم حدیث: 1281، باب افضل الصدقة اصلاح ذات البین، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، الطبعة الثانية: ۱۴۰۲ھ/1986ء۔
17. الترمذی، ابو عیسیٰ، محمد بن عیسیٰ بن سورة، السنن: ۴/244، ابواب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ، باب نمبر: 56، رقم حدیث: 2509، دار الغرب الاسلامی بیروت، سنۃ النشر: 1998ء۔
18. ایضاً۔
19. الملأ، علی بن سلطان القاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: ۸/۳۵۱۳، باب ما ینھی عنہ من التہاجر، الفصل الثانی، رقم حدیث: ۳۰۵، الناشر: دار الفکر بیروت، الطبعة الاولى: ۲۰۰۲ء۔
20. مولانا، محمد عثمان، البشیر والنذیر اردو ترجمہ و شرح الترغیب والترہیب، ص: 4/428،، دار الاشاعت اردو بازار کراچی، سن اشاعت: 2005ء۔
21. البیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین، شعب الایمان: 13/429، باب فی الاصلاح بین الناس اذا مر جوا، رقم حدیث: 10579، مکتبۃ الرشد، ریاض سعودیہ، الطبعة الاولى: 1423ھ/2003ء۔

22. الطبرانی، سلیمان بن احمد بن ایوب، المعجم الکبیر: 257/۸، عبد اللہ بن حفص، عن ابی امامہ، رقم حدیث: 7999، مکتبۃ ابن تیمیہ، القاہرہ، الطبعة الثانية
23. القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن: 385/۵، تحت سورة النساء، آیت نمبر ۵۱۱، دار الکتب المصریہ، القاہرہ، الطبعة الثانية: 1384ھ۔
24. ابن ابی اسامہ، ابو محمد الحارث بن محمد بن داهر المعروف بابن ابی سامہ: بغیۃ الحارث عن زوائد مسند الحارث: 309/۱، باب فی خطبہ قد کذبھا داؤد بن بن المجر علی رسول اللہ ﷺ، رقم حدیث: 205، الناشر: مرکز خدمۃ السنۃ والسیرة النبویہ، المدینۃ المنورۃ، الطبعة الاولى: 1996ء۔
25. ابن ابی الدنیا، ابو بکر عبد اللہ بن محمد المعروف بابن ابی الدنیا: مداراة الناس، ص: 120، باب الاصلاح بین الناس، الناشر: دار ابن حزم، بیروت لبنان
26. الملاء، علی بن سلطان القاری، مرقاۃ المفاتیح: 3154/۸، باب ما یمنعی عنه من التہاجر، الفصل الثانی، الناشر: دار الفکر بیروت، الطبعة الاولى: ۲۰۰۲ء۔
27. القرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن: 385/۵، سورة النساء، تحت آیت نمبر: 115، الناشر: دار الکتب المصریہ، القاہرہ، الطبعة الثانية: 1384ھ۔
28. البخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، الصحیح: 183/۳، کتاب الصلح، باب لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس، رقم حدیث: 2692، الناشر: دار طوق النجاة بیروت، الطبعة الاولى: 1422ھ۔
29. النیشاپوری، ابو الحسین مسلم بن الحجاج، الصحیح الجامع: 2011/۴، کتاب البر والصلۃ والاداب، باب بیان تحریم الکذب و بیان ما ینبایح منها، رقم حدیث: 2605، الناشر: دار احیاء التراث العربی بیروت، سن اشاعت ندارد۔
30. محمد مسعد یاقوت، صنائع المعروف: ثلاثون باباً عن ابواب الخیر، ص: 35، مصر: مکتبۃ شاملہ سی ڈی، سن ندارد۔ الشیخ صالح وآخرون، نضرۃ النعم فی مکارم اخلاق الرسول اکرم ﷺ: 376/۲، من الآثار و اقوال العلماء فی الاصلاح، الناشر: دار الوسیلۃ، جدہ: الطبعة الرابعة، سن ندارد۔
31. تاریخ سعدی، مصحح الدین شیرازی، گلستان، ص: 18، کراچی: دار الاشاعت، سن ندارد۔
32. ابن کثیر، ابو الفداء، اسماعیل بن عمر الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم: 24/۷، الناشر: دار طیبہ، الطبعة الثانية: 1420ھ۔
33. البخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، الصحیح: ۳۸۱/۳، کتاب الصلح، باب قول الامام لا یتحابون اذھبوا بنا نصلح بینکم، رقم حدیث: 3926، الناشر: دار طوق النجاة، الطبعة الاولى: 1422ھ۔
34. الطھمید، سلیمان بن محمد، شرح الاربعین النوویۃ، ص: ۷۷، الناشر: مکتبۃ شاملہ سی ڈی (الاجزاء الحدیثیۃ)
35. ابن البیج، ابو عبد اللہ الحاکم محمد بن عبد اللہ، النیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین: 185/۴، رقم حدیث: ۱۱۳۷، واما حدیث عبد اللہ بن عمرو، الناشر: دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ الطبعة الاولى: 1990ء۔
36. ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، السنن: 553/۱، کتاب الصیام، باب صیام یوم الاثنين، رقم حدیث: 1740، دار احیاء الکتب العلمیہ، بیروت، سن ندارد۔

37. ابن القیم الجوزیہ، محمد بن ابوبکر بن ایوب، اعلام الموقعین: ۱/ 84، فصل الصلح بین المسلمین، الناشر: دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ الطبعة الاولى: 1411ھ۔
38. الحکفی، علاء الدین محمد بن علی، الدر المختار مع رد المحتار: ۵/ 423، کتاب القضاء، مطلب: طاعة الامام واجبة، الناشر: دار الفکر، بیروت، الطبعة الاولى: 1412ھ۔
39. السلمان، عبدالعزیز بن محمد بن عبدالمحسن: موارد الزمان لدروس الزمان: ۳/ 551، العدل وما یعتبر للعدالة، مکتبہ شاملہ سی ڈی، الطبعة: الثلاثون: 1424ھ۔
40. شحاتہ محمد صقر، دلیل الواعظ الی ادلیۃ المواعظ، ص: 290، 289، فضل الصلح واداب الصلح، الناشر: دار الفرقان للتراث، البحیرہ (مصر) شاملہ سی ڈی۔
41. النساء: 4: 114۔
42. الحجرات: 9: 9۔
43. جماعة من العلماء، فصل الاصلاح بین الناس: ۱/ اکلتیہ شاملہ سی ڈی، سن ندارد۔

THE HISTORICAL AND PRIMARY TRADE PASSES OF ARABIAN PENINSULA

سرزمین عرب میں تجارت کا پس منظر

سعدیہ ارم ریسرچ اسکالر شعبہ اسلامک لرننگ، جامعہ کراچی

ABSTRACT: Trade is a means of livelihood that creates a mutual connection between society and economy. Existence of Trade is important to meet the necessities of human lives. History shows that there have been many nations who primarily exchanged their native products with other nations. Arabs are specially mentioned among such nations because Trade was the best means of livelihood for them. Their geographical location of Arabian Peninsula is a desert area and mountainous region. Hardly any part of the land was fertile and yield was insufficient as compared to the population. Other necessities of life had to be managed as well, and hence Arabs heavily relied on trade. Since the Arabian Peninsula was also the gateway into the three largest continents, trade had become an essential part of their economy. Arab trading has continued through land and seas. One of the most important trade passes is the pass between Yemen and Syria. For the Quraish, Makkah was the center and it has always had a religious significance due to the Kaaba. The Quraish tribe had some sort of religious superiority because of their claim to be custodians of the Holy Kaaba. They played an important role in strengthening the Arab trade. The historical and primary trade passes of Arabian Peninsula, and products and the trade of Holy Prophet (P.B.U.H) have been briefly discussed in this article.

Keywords: Islamic Trade, Trade in Arab, Arabs trade, Trade in Prophetic era.

عربوں میں تجارت قدیم زمانے سے رائج اور وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ بلکہ دنیا میں عربوں کی شہرت کی بڑی وجہ تجارت ہی تھی، جو بین الاقوامی راستوں سمیت بڑے خطے میں منتشر تھی۔ حتیٰ کہ چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کے ظہور سے قبل صرف مکہ مکرمہ کے عرب تاجرانے اپنے خطے میں اکثر تجارتی قافلوں کے مالک تھے۔ جب کہ جزیرہ عرب کے دیگر قبائل بھی بصرہ کے قریب اس جزیرہ نما کے ساحل سے مغرب میں بحیرہ قلزم کے اختتام پر خلیج عقبہ تک مختلف قافلوں کی صورت میں سامان تجارت لاتے اور لے جاتے تھے۔ عربوں نے تجارت میں اس حد تک سرگرمی اس لیے دکھائی کہ وہ صحراؤں، چٹیل میدانوں اور سنگلاخ پہاڑی علاقوں کے باشندے تھے، جہاں زراعت ممکن نہیں تھی۔ صرف یثرب یعنی مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں کھجوروں کی پیداوار تھی، یاطائف اور دیگر جنوبی علاقوں میں کچھ پھل وغیرہ کی فصلیں ہوتی تھیں۔ مقامی طور پر صنعت بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، صرف اونٹ کے بالوں سے مقامی عورتیں کچھ کپڑا وغیرہ بن لیتیں یا مرد ہتھیار سازی کرتے، جو دیگر خطوں کی ان مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ عام عربوں کا گزر بسر مویشیوں پر تھا، لیکن دیگر ضروریات زندگی کے لیے کچھ اور بندوبست ضروری تھا۔ اس لیے عربوں نے تجارت کی راہ اختیار

کی، جس سے جہاں ایک طرف انہیں ضروریاتِ زندگی سے لے کر اشیائے آرائش و آسائش میسر آئیں، وہیں ان کے مال و دولت میں اتنی برکت ہوئی کہ وہ سرمائے میں بڑی بڑی سلطنتوں کے تاجروں کا مقابلہ کرنے لگے۔

یہ لوگ ہتھیار، ریشم، خوشبوئیں، ہاتھی دانت، آبنوس، مسالے اور گندم لے کر بلادِ شام اور وہاں سے آگے قسطنطنیہ تک جاتے تھے۔ یہ تمام اشیاء مشرقِ بعید، چین، بھارت اور افریقا سے آتیں، جب کہ یمن جہاں زراعت کا رواج قدیم زمانے سے تھا، عربوں کی خوردنی ضروریات پوری کرنے کا باعث بنتا۔ شام سے واپس لوٹنے والے قافلے وہاں سے خشک میوے، غلہ، خوردنی تیل، مختلف اقسام کے کپڑے اور سونا وغیرہ لاتے۔ اسی طرح عراق سے کھجور اور چڑا لایا جاتا۔ اس حوالے سے یورپی مستشرق ولیم ہائیڈ لکھتا ہے: ”مشرق ہمیشہ سے وہ تمام ساز و سامان بنانے کا مرکز تھا، جو دنیا کے حریص اشرفیہ کی ضرورت تھا۔ یہ لوگ ہندوستان سے مسالے لاتے، جنہیں افریقی اور رومی اپنے پکوانوں میں لذت لانے کے لیے استعمال کرتے۔ اسی طرح وہاں کی خوشبوؤں سے اپنے جسموں اور گھروں کو معطر کرتے، اور ہاتھی دانت سے اپنے گھروں کا قابلِ فخر سامانِ ضرورت و آرائش بناتے۔ چین میں ریشم بنایا جاتا، جو عورتوں کے ساتھ رجاں سلطنت اپنی آسودگی کے اظہار کے لیے زیب تن کرتے۔ جہاں تک جوہرات کی بات ہے، تو ہندوستان اور فارس کے پہاڑی علاقے قیمتی پتھروں کا معدن تھے۔ اسی طرح بحرِ ہند کے ساحل موتی اگلتے تھے۔ یہ تجارت رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ رومی سلطنت پلائن کے دور میں ایشیا کو سالانہ درآمدات کی مد میں 10 کروڑ سسٹرس (رومی اشرف) ادا کرتی تھی، جن کی مالیت 2 کروڑ فرانک بنتی ہے۔ ان میں سے نصف صرف ہندوستان وصول کرتا تھا۔“^(۱)

یہ تمام اشیاء جزیرہ عرب میں مقامی سطح پر ان تمام بازاروں اور منڈیوں میں بھی بیچی جاتی تھیں۔ پھر وہاں سے کئی بازاروں اور منڈیوں سے ہوتی ہوئی دنیا کے مختلف خطوں میں پہنچتیں، کیوں کہ جزیرہ عرب دنیا کے 3 بڑے براعظموں ایشیا، افریقا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ اس بنا پر اہم بین الاقوامی تجارتی راستے یہی سے گزرتے تھے۔ خاص طور پر یمن اور شام کے درمیان کا تجارتی راستہ، جس کا اہم ترین پڑاؤ قریش کا مسکن مکہ مکرمہ تھا۔ اس پر ڈاکٹر محمد یوسف الدین لکھتے ہیں: ”تاریخ کے قدیم دور ہی سے جزیرہ نمائے عرب کی اہمیت واضح ہے۔ یہ تین براعظموں کا مقامِ اتصال ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چین، ہندوستان، ایران وغیرہ مشرقی ممالک سے یورپی ممالک کو جو تجارتی سامان جاتا تھا، وہ عراق اور شام وغیرہ کے علاقوں ہی سے ہو کر جاتا تھا۔ حجاز کے ایک شہر مکہ کی نسبت بتایا گیا ہے کہ یہ کاروانی راستے پر اہم اسٹیشن تھا۔“^(۲)

عربوں کی تجارت:

عربوں نے اپنے محل وقوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے تجارت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی تجارت اونٹوں کے قافلوں کی صورت

میں بری اور کشتیوں کے ذریعے بحری راستوں پر جاری رہی، اور عرب تینوں براعظموں کے درمیان تجارتی ربط کا سبب بنتے رہے۔ وہ اپنے خطے کی تزویراتی اہمیت جانتے تھے، اس لیے اپنی کوئی سلطنت نہ ہونے کے باوجود بڑی بڑی سلطنتوں کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرنے میں ناصرف کامیاب رہے، بلکہ ایک حد تک ان کی ضرورت بھی بن گئے۔

جزیرہ عرب کے باشندوں نے تجارت کے لیے 2 بنیادی راستے اختیار کیے۔ ایک بحیرہ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ گزرنے والا تجارتی راستہ جو طائف، مکہ مکرمہ اور یثرب یعنی مدینہ منورہ سے ہوتا ہوا جنوب میں یمن سے شمال میں شام جاتا تھا۔ وہ اسے ”طریق العطور“ اور ”طریق البعور“ کہتے تھے۔ شام میں البتراء پہنچ کر اس کی 2 شاخیں ہو جاتی تھیں۔ ایک راستہ شمال مشرق میں تدمر کی جانب جاتا تھا، جب کہ دوسرا مغرب میں غزہ کو پہنچتا تھا۔

یہ مرکزی راستہ طول میں جنوب سے شمال کی جانب جاتا تھا، جب کہ عرض میں اس سے کئی راستے نکلتے تھے۔ مثلاً: جزیرہ عرب کے جنوب مغرب سے جنوب مشرق کے درمیان ایک تجارتی راستہ تھا، جو یمن میں گوند کی پیداوار کے علاقوں سے 600 میل دور دار چینی پیدا کرنے والے علاقوں کے درمیان تھا۔ اس راستے پر تمنع شہر تھا، جہاں سے مرکزی تجارتی راستہ شروع ہوتا تھا۔ دوسرا ذیلی راستہ جنوب سے شمال میں جبرہ اور وہاں سے راندین یعنی دجلہ اور فرات کے علاقے تک جاتا تھا۔ اس کے ساتھ بحری راستہ بھی تھا۔ ایک راستہ مرکزی شاہراہ پر مکہ مکرمہ سے نکلتا تھا اور وادی راندین پہنچتا تھا۔ عہد اسلامی میں اسے ”شاہراہ زبیدہ“ کا نام دیا گیا۔ ایک راستہ نواح یثرب سے نکلتا تھا، اور تیما اور دومة الجندل سے ہوتا ہوا وادی راندین میں بابل تک جاتا تھا۔ جب کہ ایک راستہ جزیرہ عرب کے انتہائی شمال میں تھا، جو رمادی سے فرات کے ساتھ ساتھ ماری اور مغرب میں تدمر و حمص تک جاتا، پھر اسے کئی راستے نکلتے، جو دمشق اور بحیرہ روم کے ساحلوں تک پہنچتے تھے۔

عربوں کی تجارت کا دوسرا بنیادی راستہ سمندری تھا، جو مشرق خاص طور پر قرن افریقا کو ہندوستان، سیلان، چین اور جنوب مشرقی ایشیا سے جوڑتا تھا۔ ہندوستان سے بحیرہ عرب کے راستے تجارتی سامان عمان پہنچتا، اور پھر خلیج عدن اور بحیرہ احمر کے راستے مصر جاتا۔ تاہم بحری راستوں کی مشقت اور مشکلات کے باعث زیادہ تر تجارتی سامان عمان کی مختلف بندرگاہوں پر اترتا اور پھر بری راستوں کے ذریعے شام، وہاں سے غزہ اور پھر مصر پہنچتا تھا۔⁽³⁾

یہ تجارتی سامان جزیرہ عرب اور عربوں کے جن مشہور بازاروں اور منڈیوں میں بکتا تھا، ان کے نام، محل وقوع اور تاریخ انعقاد کا تذکرہ دعوت و تبلیغ کے باب میں گزر چکا ہے، لیکن عربوں کی تجارت ان ڈیڑھ درجن بازاروں پر ہی منحصر نہیں تھی، بلکہ تقریباً ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں بازار موجود تھے، اور ان کے لیے مقامات خاص کیے گئے تھے۔ یہ بازار شہر کے وسط، عبادت گاہ کے سامنے یا کسی ایسی

جگہ قائم کیے جاتے جہاں سے دور کی مسافت سے بھی انہیں دیکھا جاسکتا، یا شہر سے باہر مرکزی دروازے کے ساتھ یا راستوں کے سنگم پر ان کا قیام عمل میں آتا۔ ان میں دکانیں بھی ہوتیں، جب کہ مقامی عمائدین ان کے امور اور سرگرمیوں کی نگرانی کرتے۔ ایسی تمام بڑی آبادیاں جو تجارتی شہر اہوں پر واقع تھیں، وہ قافلوں اور مسافروں کا پڑاؤ ہوتیں، جہاں خرید و فروخت کا سلسلہ سارا سال جاری رہتا۔ قافلوں کی آمد پر مقامی تاجر اور عام لوگ ان کا رخ کرتے، اور سامان، مصنوعات اور غلے وغیرہ کا تبادلہ یا خرید و فروخت کرتے۔⁽⁴⁾

جزیرہ عرب اور مشرق وسطیٰ کا ہر ملک علاقے مخصوص مصنوعات کے لیے شہرت رکھتا تھا، تاہم ان میں سے کچھ اشیاء ہیں پیدا ہوتی یا بنتی تھیں، جب کہ کچھ دیگر ممالک سے وہاں پہنچائی جاتیں اور پھر وہاں سے باقی عرب خطے میں ان کی ترسیل ہوتی۔ ان اشیاء اور ان کے لیے مشہور اماکن کی تفصیل ڈاکٹر محمد سہیل طقوش نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”یمن سے دھاری دار، منقش اور ریشمی دھاریوں والی مخصوص چادریں، زعفران، رنگ، خضاب، مختلف قسم کے گوند، بخور، خوشبوئیں، مسالے اور عقیتات تھے۔ عمان کے علاقے بحرین سے موتی اور ہجر سے کھجوریں آتیں۔ شام سے زیتون کا تیل، کشمش، گندم و آٹا، شیشے کے برتن، صیدا و صورت کار جو ان، تل کا تیل اور سونے چاندی کی مصنوعات لائی جاتیں۔ عسقلان سے مہندی اور غرہ و بصریٰ سے اعلیٰ شراہیں آتی تھیں۔ جب کہ مقامی لوگ اون، بال، اونٹوں کا دھاگا، مختلف تیل، چربی، اونٹ و دیگر مویشی، صاف کردہ کھالیں، جوتے اور چرمی تھیلے وغیرہ فروخت کرتے۔“⁽⁵⁾

اسی طرح عربوں میں مختلف اقسام کے سودوں اور کاروباری طریقوں کا رواج تھا۔ تجارت کے لیے اصول و ضوابط تھے، جن کی مخالفت کرنے والے کے خلاف کارروائی کی جاتی یا اسے کاروبار کرنے سے روک دیا جاتا تھا۔ کوئی شے کس جگہ کی پیداوار یا مصنوعہ ہے، اس حوالے سے اس پر مخصوص علامت موجود ہوتی۔ جب کہ جس چیز پر یہ صراحت یا علامت نہ ہوتی، وہ بازار میں مقبول ہوتی نہ کوئی اسے خریدتا۔ اسی طرح چوری شدہ مال فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوتی اور ایسا مال بیچنے والے کو گرفتار کر لیا جاتا۔ مقامی تاجر اور خریدار اس وقت کے رائج سودوں اور معاملات سے باخوبی واقف تھے۔ مروجہ سودوں اور ان کے طریقوں میں سے مشہور یہ تھے:

1- **بیع برمی الحصة:** خریدار کسی چیز پر کنکری مار دیتا، تو اس کے لیے لازم ہو جاتا کہ اسے خریدے اور اس معاملے میں اس کا اختیار ختم ہو جاتا۔ اسی طرح کبھی تاجر کہتا کہ کسی بھی چیز یا پوڑ میں کسی بھی جانور پر کنکری مارو، وہ اتنے میں تمہارا ہوا۔ یا جہاں تک کنکری گئی زمین یا فصل تمہاری ہوئی، کبھی خریدار کہتا کہ میری مٹھی میں جتنی کنکریاں ہیں، اتنے درہم میں یہ چیز تمہاری۔ یا خریدار کہتا کہ میری مٹھی میں جتنی کنکریاں ہیں، ان کے بہ قدر اشیاء تیری رقم میں میری۔ اسی طرح خریدار سامان پر پتھر رکھ دیتا۔ یہ تمام بیع برمی الحصة کہلاتی تھیں۔

2- **بیع منابذہ:** بھڑاؤ کے دوران فروخت کنندہ اگر اپنی چیز خریدار کی جانب یا دونوں اپنی اشیاء ایک دوسرے کی جانب پھینک دیتے، تو سود لازم ہو جاتا ہے۔ سودے کی تکمیل کے اس عمل کو منابذہ کہتے تھے۔

3- **بیع ملامسہ:** اسی طرح اگر اس دوران خریدار سامان پر یا تاجر قیمت مبادل پر ہاتھ رکھ دیتا، تو سود لازم ہو جاتا، یا خریدار اندھیرے میں یا

کسی چیز میں لپٹی ہوئی چیز پر ہاتھ رکھتا اور تاجر اس سے کہتا کہ اتنے کی دیتا ہوں، فوری لینی ہوگی اور چیک کرنے کی اجازت نہیں، تو خریدار کو خریدنے سے قبل اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

4- بیع معاومہ: اسے بیع السنین بھی کہتے تھے۔ اس میں کسی بھی زمین کے پھل کا دو، تین یا زیادہ برسوں کے لیے پیشگی سودا کر لیا جاتا تھا۔

5- بیع مزاہنہ: درخت پر لگی تازہ کھجوریں یا پھل ماپ پر، خشک کھجوروں یا درخت سے اترے ہوئے پھل کے بدلے بیچنا۔

6- بیع محالہ: یہ مزاہنہ کی طرح ہوتی تھی، لیکن اس کا تعلق غلے سے تھا۔

7- بیع مخارہ: پیداوار کے متعین حصے پر کاشت کاری کا معاہدہ کرنا۔ یہ مزارعت کے ہم معنی یا قریب تر تھی۔

8- بیع حمل بالمجلہ: بچہ جنم تک کے لیے اوٹنی کے مالک کو زعفر و خست کرنا اور قیمت پہلا بچہ مقرر کرنا۔

9- بیع تصریہ: فروخت سے چند روز قبل اوٹنی یا بکری دودھ دھونا بند کر دینا، تاکہ تھن خوب بھرے معلوم ہوں اور خریدار زیادہ دودھ والی سمجھ کر خرید لے۔

10- بیع سرار: یہ سوق عکاظ کا خاصہ تھی۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ سودے کے وقت تاجر کے پاس ایسے افراد بھی آجاتے، جو قیمت میں زبانی کلامی اضافہ کرتے، لیکن ان کی نیت خریدنے کی نہیں ہوتی، تو خریدار اس تاجر کو کہتا کہ میں اسے آگے فروخت کروں گا اور اس نفع میں تم شریک ہو گے۔ اس طرح وہ غیر سنجیدہ خریداروں سے جان چھڑا لیتا۔

11- بیع ناجز: نقد ادا ایگی اور سامان کی فوری حوالگی والی معروف ترین خرید و فروخت کو بیع ناجز کہا جاتا تھا۔

12- بیع جس: اس کا رواج سوق صنعا میں تھا۔ یہ ملاسمہ ہی کی کوئی قسم تھی۔⁽⁶⁾

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل از مسیح و اسلام بھی عربوں کی تجارت بے قاعدہ و ضابطہ نہیں تھی، بلکہ ان کے ہاتھ بھی ایک بڑا نظام موجود تھا، جس کے تحت یہ سب تجارتی سرگرمیاں صدیوں سے جاری تھیں۔ نیز دنیا میں اس وقت عربوں کا تعارف بھی 2 حیثیتوں سے تھا، ایک بدویت اور دوسری تجارت۔

قریش کی تجارت

عربوں میں قریش کو ہر اعتبار سے فضیلت اور برتری حاصل تھی۔ ایک طرف وہ بیت اللہ کے متولی اور امور حج کے منتظم و نگران تھے، جس کے باعث مشرکین میں مذہبی اعتبار سے انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، تو دوسری طرف ان کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاملتا تھا، اس بنا پر انہیں سماجی طور پر بھی عزت حاصل تھی۔ ساتھ ہی تجارت میں ان کے سرمائے اور قافلوں نے عربوں کے درمیان پورے جزیرہ عرب میں ان کی اقتصادی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ بعض

نے تو قریش کی وجہ تسمیہ ہی تجارت کو قرار دیا ہے۔ مثلاً: ابن ہشام نے لکھا ہے: ”قریش اس سبب سے کہتے ہیں کہ قریش ”تَقْرِش“ سے ماخوذ ہے، اور تقرش کے معنی کسب اور تجارت کے ہیں۔“ (7)

اسی طرح ابوالولید ازرقی کا بیان ہے: ”کہا جاتا ہے کہ قریش کا یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ وہ تاجر تھے۔ کسب و تجارت کرتے ہوئے جنگھٹا بنالیتے تھے، اس لیے انہیں ایک سمندری مچھلی (قرش یعنی شارک) سے تشبیہ دی جانے لگی۔“ (8)

قریش نے اپنی مذہبی اور سماجی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ جاہلیت میں دیگر قبائل کا وتیرہ یہ تھا کہ وہ باہم جنگیں کرتے، اور ان کے نتیجے میں ایک دوسرے کو غلام بنا کر فروخت کرتے اور اموال کو حلال سمجھ کر لوٹ لیتے۔ اکثر قبائل کا ذریعہ معاش یہی تھا۔ لیکن قریش کے لیے یہ راستہ اختیار کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے انہوں نے تجارت کو اپنا یا اور اپنا شرف برقرار رکھا۔ جاحظ لکھتا ہے: ”قریش تمام عربوں میں دین کے معاملے میں بڑے جذباتی اور متشدد تھے۔ انہوں نے جنگ و جدال اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ انہیں قیدی بنانا، دوسروں کے اموال حلال کرنا اور مالِ غصب کو اچھا سمجھنا پسند نہیں تھا۔ لڑائی سے کنار کشی کے بعد ان کے پاس تجارت کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہیں بچا تھا۔ اس لیے وہ دور دراز علاقوں جیسے روم میں قیصر، حبشہ میں نجاشی اور مصر میں مقوقس کے پاس گئے، اور ان سب کے ساتھ تجارتی روابط قائم کر لیے۔“ (9)

قریش کی اس بین الاقوامی تجارت کی ابتدا ہاشم بن عبد مناف کے دور میں ہوئی۔ انہی کو مکہ مکرمہ پر قریش کی بلادستی قائم کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انہیں اپنے باپ دادا سے قریش کی سرداری ملی۔ اس وقت قریش کی تجارت مکہ مکرمہ کے مقامی بازاروں یا حج کے موسم میں لگنے والی منڈیوں اور میلوں تک محدود تھی۔ ہاشم نے اس محدود تجارت پر قناعت کو اپنی قوم کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مکہ مکرمہ کے محل وقوع اور شمال و جنوب کے درمیان سفر کے لیے اس اہم پڑاؤ کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے جزیرہ عرب سے نکل کر تجارت کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنی قوم کی مالی حالت بہتر بناسکیں اور اس کے لیے دینی کے ساتھ ساتھ سماجی مقام بھی دلا سکیں۔ امام فخر الدین رازی نے یہ پس منظر یوں بیان کیا ہے: ”قریش میں سے کسی کو فقر و فاقہ لاحق ہو جاتا، تو وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر کسی الگ تھلگ جگہ چلا جاتا اور وہاں خیمہ لگا کر موت کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ یہاں تک کہ ہاشم بن عبد مناف آئے، جو قوم کے سردار تھے۔ ان کا ایک بیٹا تھا اسد۔ اس کا ایک دوست بنی مخزوم سے تھا، جس سے اسے بہت محبت تھی اور وہ اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس نے اسد سے تنگی اور فاقہ کی شکایت کی۔ اسد اپنی ماں کے پاس روتا ہوا آیا۔ ماں نے ان کے پاس آنا اور کچھ چربی بھیج دی، جس پر وہ کئی روز تک گزارا کرتے رہے۔ اسد کے پاس اس کا دوست پھر آیا اور فاقوں کا رونا رویا۔ اس پر ہاشم نے اپنی قوم قریش کو جمع کر کے خطبہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ تم شدید قحط کا شکار ہو، جس کے باعث تمہاری تعداد اور طاقت دونوں کم ہو رہی ہیں۔ حالاں کہ تم اللہ کے حرم کے متولی اور اولادِ آدم میں معزز ترین ہو، جب کہ باقی لوگ تمہارے پیچھے چلنے والے ہیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ہم تو آپ کے تابع دار ہیں۔ ہم

میں آپ کی سرداری پر کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر ہاشم نے ہر خاندان کے فرد کو جمع کر کے دوسفروں یعنی سردی میں یمن اور گرمی میں شام کی جانب تجارت کے لیے بھیجنا شروع کیا۔ کسی بھی مال دار کو اس سے جو نفع ہوتا، وہ اسے اپنے اور ناداروں کے درمیان تقسیم کر لیتا۔ اس طرح ان کے غریب بھی امیروں کی طرح ہو گئے۔ اسلام آیا، تو اس وقت بھی وہ اسی منہج پر تھے، اور عربوں میں قریش سے زیادہ کوئی قبیلہ مال دار اور معزز نہ تھا۔“ (10)

یہ دونوں سفر موسم کی مناسبت سے اختیار کیے گئے تھے۔ یمن کا محل وقوع جزیرہ کے جنوب میں تھا، جو خط استوا کے قریب ہونے کے باعث گرم علاقہ تھا اور خاص طور پر اس کے جنوبی ساحلی علاقوں میں سخت سردی نہیں پڑتی تھی۔ جب کہ شام شمال میں ہونے کے باعث سخت سرد تھا اور وہاں برف تک پڑتی تھی، اس لیے شام کی جانب سفر موسم گرما ہی میں ممکن تھا، جب کہ یمن کے لیے سردیوں کے مہینے مناسب تھے۔ اس لیے ہاشم نے یہ دو تجارتی سفر مقرر کیے۔

اس بین الاقوامی تجارت کے لیے قریش نے مختلف سلطنتوں کے ساتھ تجارتی معاہدے بھی کیے۔ ان تجارتی معاہدوں کا سہرا بھی ہاشم بن عبد مناف کے سر سجتا ہے۔ ایک بار وہ شام گئے تو قیصر تک ان کا شہرہ پہنچ گیا۔ شاہِ روم نے انہیں بلایا اور گفتگو کی، جو اسے پسند آئی۔ اس طرح ہاشم کا قیصر کے دربار میں آنا جانا ہو گیا۔ ایک بار انہوں نے قیصر سے کہا کہ ”اے بادشاہ میری قوم عرب ہے، جو تاجر ہیں۔ انہیں ایک پروانہ شاہی دے دیجیے، جو انہیں اور ان کی تجارت کو تحفظ فراہم کر دے۔“ قیصر نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ وہ یہ پروانہ لے کر واپس جازر وانہ ہوئے اور راستے میں جس جس قبیلے سے گزرتے اس کے ساتھ تحفظ تجارت کا معاہدہ ”ایلاف“ کرتے جاتے کہ وہ قریش سمیت تمام عربوں کے تجارتی قافلوں کو امن دیں گے۔ یوں مکہ سے شام تک پُر امن تجارتی راستہ قائم ہو گیا۔

یہ سب ہاشم کا کارنامہ تھا، اس لیے قریش سب سے زیادہ اس معاہدے سے مستفید ہوئے۔ تاہم ہاشم کے انتقال کے بعد انہیں کچھ اندیشہ ہوا کہ شام کی جانب سفر تجارت کے لیے انہیں حاصل خصوصی حقوق ختم نہ ہو جائیں، اس لیے ہاشم کے بھائی عبد شمس شاہِ حبشہ نجاشی کے پاس گئے، اور اپنی قوم کی طرف سے ایک تجارتی معاہدہ کیا۔ نوفل نے عراق کا رخ کیا اور شاہِ فارس کسریٰ کے ساتھ اسی نوعیت کا معاہدے کر کے لوٹے۔ جب کہ مطلب نے یمن کے قبائلی سرداروں کے ساتھ معاہدے کر لیے۔ یوں قریش کی تجارت کو بین الاقوامی سطح پر تحفظ ملا اور ان کے مال و دولت میں اضافہ ہوا۔ (11)

قریش اپنے تجارتی سفروں کے دوران مال بردار قافلوں کے ساتھ حفاظتی دستے اور ہتھیار بھی لے کر چلتے تھے۔ یہ حفاظتی دستے عام طور پر بنو غفار یا ان قبائل کے ہوتے جو قریش کے ساتھ تجارتی قافلوں کی ہم رکابی چاہتے۔ اس ہم رکابی کے بدلے وہ قریش کے قافلوں کی حفاظت کرتے۔ جب کہ قریش کے اپنے غلام، موالی اور حلیف بھی اس مقصد کے لیے ساتھ ہوتے۔ نیز آگے آگے چلنے کے

لیے رہبر بھی ساتھ لیے جاتے، جو قافلوں کو راستہ دکھاتے۔

ان سفروں نے قریش کو تجارتی اور اقتصادی طور پر ہی فائدہ نہیں پہنچایا، بلکہ زندگی کے کئی شعبوں میں بھی ان کی رہنمائی کی۔ مثلاً ان کے ذریعے روم، فارس اور حبشہ سے قریش کے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ یہ امتیاز و اعزاز کسی اور عرب قبیلے کو حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح قریش نے ان اسفار سے کئی مفید فنون بھی سیکھے، جن میں لکھنا پڑھنا سر فہرست ہے۔ ان قافلوں میں شامل کچھ قریشیوں نے حیرہ میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور مکہ مکرمہ لوٹ کر اپنی قوم کو سکھایا۔ اس لیے جب اسلام آیا، تو اس شہر میں ایک بڑی تعداد لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اکثر کاتبین وحی قریش ہی سے تھے۔

تجارتی اسفار نے دیگر قوموں کے ساتھ میل جول کے باعث قریش کو عرب قبائل کے مقابل علم، تہذیب اور ثقافت کا حامل بنا دیا تھا۔ غیر ملکیتوں کے ساتھ لین دین کر کے اور ان کے معاملات دیکھ کر قریش نے خرید و فروخت میں ان کا طرز عمل اور تجارت میں ان کا نظم و نسق سیکھ لیا تھا۔ جب کہ شام، فارس اور حبشہ جیسی اس وقت کی عظیم سلطنتوں کے اشراف اور باشندوں سے رابطے نے انہیں امور سیاست میں بھی بہت کچھ سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ بلکہ یہی نہیں، قریش نے شعر و سخن میں جو مقام حاصل کیا، اس کی بڑی وجہ بھی یہی وسیع مشاہدہ تھا۔ (12)

قریش کے مردوں کے ساتھ عورتوں میں بھی تجارت اور سرمایہ کاری کا رواج تھا۔ خاندان بنو اسد کی خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے کون واقف نہیں۔ وہ انتہائی امیر کبیر تھیں اور اپنا سرمایہ تجارتی قافلوں میں لگایا کرتی تھیں۔ ان کی یہی کاروباری سرگرمی رسول اللہ ﷺ سے شادی کا سبب بنی، جس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بھی درجنوں قریشی خواتین تجارت کرتی اور ان قافلوں میں اپنا سرمایہ لگایا کرتی تھیں۔ محمد یوسف الدین لکھتے ہیں: ”قریش کی عورتوں کو بھی تجارتی کاروانوں سے اسی قدر دلچسپی تھی، جتنی دلچسپی ان کے شوہروں کو تھی۔ بدرقہ (کانوائے) کی واپسی پر ابوسفیان کے اطراف جمع ہوتی تھیں، تاکہ یہ معلوم کریں کہ انہوں نے جو روپیہ پیسہ لگایا تھا، اس میں کیا نفع ملا اور نفع میں ان کو کتنا حصہ ملا۔“ (13)

غرض قریش من حیث القوم تجارت کیا کرتے تھے اور اسلام کی آمد سے قبل جزیرہ عرب میں سب پر سبقت لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک شخص کے پاس لاکھوں درہم کا سرمایہ تھا۔ ایک وقت میں ہزاروں اونٹوں پر سامان لاد کر قافلے ہمسایہ ممالک جاتے تھے، جس سے پورے خطے میں ان کا شہرہ ہو گیا تھا اور قریش دنیا کے لیے غیر معروف قبیلہ نہیں رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ بہ صورت تاجر

رسول اللہ ﷺ بھی اسی قبیلے کے فرزند تھے، بلکہ خانوادہ ہاشم بن عبد مناف کے چشم و چراغ تھے۔ آپ یتیم پیدا ہوئے تھے،

کیوں کہ آپؐ کے والد عبد اللہ بن عبد المطلب تجارت کی غرض سے شام گئے تھے کہ واپسی پر یثرب میں اپنے ننھیال بنو نجار میں ٹھہر گئے۔ اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور وہیں انتقال کر گئے۔^(۱۴) اس حادثے کے بعد آپؐ اس دنیا میں تشریف لائے۔

ایک یتیم کے پاس کیا مال و دولت ہو گا۔ والد نے چند مولیٰ اور اُم ایمن رضی اللہ عنہا نامی باندی ترکے میں چھوڑی تھی۔ 6 برس کی عمر میں والدہ آمنہ بنت وہب کا بھی انتقال ہو گیا، تو آپؐ اپنے دادا عبد المطلب کے زیر کفالت آ گئے۔ 8 برس کے ہوئے تو دادا بھی وفات پا گئے۔ ان کے بعد چچا ابوطالب نے آپؐ کی پرورش کا ذمہ اٹھایا، لیکن وہ خود بھی مال دار نہیں تھے۔^(۱۵) کم عمری کے باوجود آپؐ اپنے چچا کے حالات کا احساس تھا اور آپؐ کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ ان پر بوجہ بنیں، اس لیے آپؐ نے لڑکپن ہی میں چند قراریط یعنی معمولی اجرت پر اہل مکہ کے مولیٰ چرانہ شروع کر دیے۔^(۱۶)

مولیٰ چرانہ رسول اللہ ﷺ کا پہلا ذریعہ معاش تھا۔ آپؐ نے تجارت کے میدان میں قدم اگرچہ جوانی میں رکھا، لیکن اس سے قبل ایک بار شام کی جانب سفر تجارت میں اپنے چچا ابوطالب کی ہم رکابی کر چکے تھے۔ اس وقت آپؐ کی عمر 12 سال تھی۔ دل کئی ماہ تک محبوب چچا سے دور رہنے پر آمادہ نہ تھا، اس لیے آپؐ نے ہم سفری کی خواہش ظاہر کی اور ابوطالب آپؐ کو ساتھ لے گئے۔ تاہم اس سفر میں تجارتی لین دین کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، کیوں کہ قریش کا قافلہ جیسے ہی شام کے سرحدی شہر بصری کے قریب پہنچا، تو ایک عیسائی راہب بحیرا نے آپؐ کو پہچان لیا کہ یہ لڑکا کوئی عام بچہ نہیں، بلکہ آخری نبی ہے، جس کی تورات اور انجیل سمیت سابقہ آسمانی کتابوں میں بشارت دی گئی ہے۔ اس نے ابوطالب سے کہا کہ اس بچے کو واپس مکہ پہنچا دو، کیوں کہ یہود اسے دیکھ کر اس کی جان کے درپے ہو جائیں گے۔ اس لیے ابوطالب آپؐ کو واپس مکہ مکرّمہ پہنچا گئے۔^(۱۷)

نوعمری میں گلہ بانی کے ذریعے کسب معاش سے رسول اللہ ﷺ بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، تو اپنا آبائی پیشہ اپنانے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ اپنے پاس سرمایہ نہ ہونے کے باعث مضاربیت کی راہ اختیار کی، کیوں کہ اس میں دوسرے کا مال اور اپنی محنت ہوتی ہے، جب کہ نفع میں فریقین شریک ہوتے ہیں، جس کا تناسب دونوں کی رضامندی پر ہوتا ہے۔ آپؐ کی سیرت طیبہ کے اس باب کو ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی نے چند سطروں میں جامع انداز سے یوں قلم بند کیا ہے: ”لڑکپن ہی سے آپؐ نے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور گلہ بانی کا نبوی پیشہ اختیار کیا، جو مالی یافت کا معمولی سہارا تھا، مگر اس نے آپؐ کو تجربات سے نوازا، اور سن شعور کو پہنچے، تو تجارت کا خاندانی اور قومی پیشہ اختیار کرنے میں لڑکپن کے بعض تجارتی اسفار کے ساتھ دلیل راہ ثابت ہوا۔ مضاربیت کے اصول پر آپؐ نے اپنی تجارت کا آغاز کیا اور مقامی تجارت سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے قومی تجارت کے دھارے میں شریک ہو گئے، اور مکہ مکرّمہ میں اپنی محنت، امانت و صلابت کے سبب ایک ممتاز جگہ بنالی، اور ایک ابھرتے ہوئے خوش حال تاجر بن گئے۔ 25 سال کی عمر شریف میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی مال دار ترین اور خوش خصال عورت سے شادی کی، تو ایک کامیاب تاجر تھے، اور پھر اپنی تجارت کو

اپنی نیک نہاد اور جاں نثار اہلیہ کی تجارت کے ساتھ مدغم کر کے 'غنی' کے اس درجے تک پہنچ گئے، جس کا حوالہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ یہ مشترکہ تجارت آخر کی عہد تک جاری رہی۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ بعثت کے بعد آپؐ نے دوسروں کو مضاربیت پر مال دے کر تجارت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپؐ کی تجارت اور غنا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت و تجارت کے محتاج اور اس پر مبنی نہ تھی، بلکہ خود مختار و آزاد تھی۔ البتہ آپؐ کی دولت و تجارت کو اس سے بہت فیض پہنچا تھا، جس طرح متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری اور ہمدردانہ قریش کی مدد سے زیت کا سامان کسی حد تک فراہم ہوا تھا۔ آپؐ کی معیشت انہیں مختلف عناصر سے مرکب تھی۔“ (18)

رسول اللہ ﷺ نے تجارت کی غرض سے شام، بصری اور یمن کے کئی سفر کیے۔ (19) اسی طرح ایک روایت میں آپؐ قبیلہ عبدالقیس کے مسکن یعنی بحرین کی جانب سفر کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ (20) آپؐ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامان تجارت لے کر ایک بار شام اور 4 بار یمن گئے، (21) جب کہ یہی کاروباری معاملہ اس عظیم جوڑے کے رشتہ ازدواج میں بندھنے کا سبب بنا۔ مولانا دریس کاندھلوی لکھتے ہیں: ”حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا عرب کے شریف خاندان کی بڑی مال دار خاتون تھیں۔ ان کی شرافتِ نسبی اور عفت و پاک دامنی کی وجہ سے جاہلیت اور اسلام میں لوگ ان کو 'طاہرہ' کے نام سے پکارتے تھے۔ قریش جب اپنا قافلہ تجارت کے لیے روانہ کرتے، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اپنا مال کسی کو بطور مضاربیت دے کر روانہ کرتیں۔ ایک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامان قریش کے کل سامان کے برابر ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر شریف 25 سال کی ہوئی اور گھر گھر میں آپؐ کی امانت و دیانت کا چرچا ہوا اور کوئی شخص مکہ میں ایسا نہ رہا کہ آپؐ کو امین کے لقب سے نہ پکارتا ہو، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ میرا مال تجارت کے لیے شام لے کر جائیں، تو آپؐ کو بہ نسبت دوسروں کے المضاعف (دگنا) معاوضہ دوں گی۔ آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب کی مالی مشکلات کی وجہ سے اس پیغام کو قبول فرمایا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ آپؐ کی برکت سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس قدر منافع ہوا کہ اس سے پیشتر کبھی اتنا نفع نہ ہوا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جتنا معاوضہ آپؐ سے مقرر کیا تھا، اس سے زیادہ دیا۔... (سفر کے) واقعات کو سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں آپؐ سے نکاح کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ سفر شام سے واپسی کے 2 ماہ اور 25 روز بعد خود حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کو نکاح کا پیغام دیا۔ آپؐ نے اپنے چچا کے مشورے سے اس کو قبول فرمایا۔“ (22)

نکاح کے بعد بعثت تک رسول اللہ ﷺ نے براہِ راست اور بالواسطہ تجارت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپؐ بیرونِ مکہ تجارتی قافلے لے جانے کے علاوہ عکاظ، مجنہ اور ذوالحجاز کے بازاروں میں بھی خرید و فروخت کیا کرتے۔ اس کی جانب جاخظ نے اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”آپؐ ایک عرصے تک تاجر رہے اور اپنے شہر میں بھی خرید و فروخت کرتے رہے۔... خرید و فروخت میں اسی شہرت کے باعث مشرکین

نے یہ اعتراض کیا: ﴿مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْسُ فِي الْأَسْوَاقِ﴾⁽²³⁾ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی جانب یہ وحی بھیجی کہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنَّهُمْ لِيَأْكُلُوا الطَّعَامَ وَيَمْشُوا فِي الْأَسْوَاقِ﴾⁽²⁴⁾ اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں، سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے

غرض اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ آپؐ سے قبل انبیائے کرام E بھی مختلف پیشوں اور تجارت سے وابستہ تھے۔“⁽²⁵⁾

اسی طرح مؤرخ ابن کثیر نے رسول اللہ ﷺ کی ابوسفیان بن حرب کے ساتھ مضاربہ کا تذکرہ کیا ہے، جو تقریباً بعثت کے سال ہی کا واقعہ ہے۔⁽²⁶⁾ البتہ بعثت کے بعد کی بلا واسطہ تجارتی مصروفیات کم ہوتی گئیں، جب کہ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد آپؐ نے مشغلے کے طور پر تجارت تقریباً ترک ہی فرمادی تھی۔ وہاں آپؐ سے خال خال ہی کچھ فروخت کرنا ثابت ہے، تاہم مختلف اشیاء کی خریداری کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: ”منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد خریداری میں اضافہ اور فروخت میں کمی واقع ہوئی۔ اسی طرح ہجرت کے بعد بھی آپؐ سے صرف چند معاملات میں فروخت منقول ہے اور اکثر یہ فروخت خریدنے والے کے لیے سود مند ہوا کرتی تھی، جیسے پیالے اور پالان کی فروخت، ایک مدبر غلام یعقوب کی فروخت، نیز ایک غلام کی دو غلاموں کے عوض فروخت۔ رہی آپؐ کی خریداری، تو یہ آپؐ نے کثرت سے فرمائی۔“⁽²⁷⁾

غرض رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے قبل اور بعد اسی طرح ہجرت سے قبل اور بعد کسی نہ کسی صورت میں یہ مشغلہ جاری رکھا۔ آپؐ نے جاہلیت کے دور میں بھی تجارت کے دوران اپنے عمل سے قریش کو بتایا کہ خرید و فروخت، کاروبار اور لین دین کے معاملات کس طرح ہونے چاہئیں۔ تاجر کو سچائی، امانت داری اور دوسروں کی خیر خواہی کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح معاملات میں صفائی اور لین دین کے ساتھ مروت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے کیے جانے والے سفروں میں اپنا اور اپنے سرمایہ کاروں ہی کا فائدہ نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اپنے ساتھیوں کے حقوق کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ جب کہ ہجرت کے بعد تو مدینہ منورہ میں احکام کا نزول کثرت سے شروع ہو چکا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد اس شعبے سے وابستہ تھی، اس لیے آپؐ نے اس دور میں تجارت کے احکام کھول کھول کر بیان کیے۔

عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تجارتی سرگرمیاں

رسول اللہ ﷺ کی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد نے بھی کسب معاش کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ان میں زیادہ تر کا تعلق قریش سے تھا، جنہوں نے اسے اپنے آباؤ اجداد کا پیشہ سمجھتے ہوئے اپنایا تھا، جب کہ دیگر کا تعلق طائف، مدینہ منورہ اور جزیرہ عرب کے مختلف مقامات سے تھا، تاہم ان میں قریشیوں کی دولت، سرمائے، سامان تجارت کی اقسام اور قافلوں کے حجم میں کسی

دوسرے علاقے کے لوگ ان کے ہمسر نہیں تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد اپنے اس نئے مسکن میں بھی تجارت ہی کو بطور ذریعہ معاش اختیار کیا۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد اور تجارتی تنوع کا تذکرہ چند صفحات میں بیان کرنا ممکن نہیں، تاہم بحث کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے ذیل میں دونوں امور پر ایک نظر ڈالی جا رہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قریشی تاجروں کے سرخیل ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، جو اسلام لانے سے قبل بھی تجارت کے لیے شام تشریف لے جاتے تھے۔ بلکہ بعض اسفار میں تو رسول اللہ ﷺ کی ہمرکابی بھی رہی۔ دونوں نے ایک سفر نوجوانی میں کیا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک 20 برس تھی، جب کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ صرف 18 سال کے تھے۔⁽²⁸⁾ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس مال و دولت کی کچھ کمی نہیں تھی۔ علامہ ابن حجر نے اس بارے میں نقل کیا ہے: ”ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ معروف تاجر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت ان کے پاس 40 ہزار درہم تھے۔ انہوں نے اس دولت سے اسلام لانے والے غلاموں کو آزاد کرایا اور مسلمانوں پر خرچ کیے۔ مدینہ منورہ آمد کے وقت بھی ان کے پاس 5 ہزار درہم موجود تھے اور وہاں بھی وہ یہی کچھ کرتے رہے۔“⁽²⁹⁾

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تجارت کا سلسلہ بھی مدینہ منورہ میں جاری رکھا۔ اس مقصد کے لیے شام کے علاقے بصری کا بھی سفر کیا۔⁽³⁰⁾ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال پر انہیں خلیفہ بنادیا گیا، تو اپنے ساتھیوں کے اصرار پر تجارت ترک کر دی۔⁽³¹⁾ اسی طرح خلافت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جاں نشین عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی جاہلیت میں تجارت کرتے تھے اور اس غرض سے کئی بار شام و دمشق تشریف لے گئے،⁽³²⁾ بلکہ ایک سفر عراق کا بھی کیا۔⁽³³⁾ انہوں نے مکہ مکرمہ میں جس طرح تجارتی سرگرمیوں سے روگردانی نہیں کی، اسی طرح مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی اہتمام سے جاری رکھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بیان کردہ مسئلہ معلوم نہ ہونے پر ”صحیح بخاری“ میں ان کا یہ قول منقول ہے: ”بازاروں میں خرید و فروخت نے مجھے اس (تحصیل علم) سے دور رکھا۔“⁽³⁴⁾

عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی انتہائی مال دار قریشی تھے۔ ”طبقات ابن سعد“ میں عبید اللہ بن دارہ سے منقول ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں تاجر تھے۔ وہ اپنا مال مضاربت پر دیتے تھے۔⁽³⁵⁾ تاجر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایک نامور شخصیت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں جتنی برکت دی، اس کا حساب نہیں۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آئے، تو رسول اللہ ﷺ نے سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھائی چارہ کر دیا۔ انہوں نے آدھا مال دینے کی پیشکش کی، تو جواب دیا کہ مجھے صرف بازار کا راستہ دکھا دو۔ وہاں جا کر خرید و فروخت کی اور اتنے تجربہ کار وزیر ک تاجر بن گئے کہ خود فرماتے ہیں کہ میں کسی پتھر کو بھی ہاتھ لگاتا تو مجھے اس کے سونا چاندی بن جانے کی امید ہوتی۔⁽³⁶⁾ اسی طرح زبیر بن العوام رضی اللہ

عنبہ بھی تجارت پیشہ تھے اور اس میدان میں قسمت کے دھنی تھے۔⁽³⁷⁾ ان کے علاوہ بھی درجنوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہما ایسے تھے، جنہوں نے یہ پیشہ اختیار کیا اور مال داروں میں شمار ہوئے۔ ان میں مدینہ منورہ کے باشندے بھی تھے اور طائف سمیت جزیرہ عرب کے مختلف علاقوں کے مکین بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد سے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس لیے جہاں یہ ضروری تھا کہ اس نومولود ریاست کا تشخص قائم کرنے کے لیے سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اس کا اپنا نظام بنایا جائے، وہیں اس بات کی بھی اشد ضرورت تھی کہ یہاں مسلمانوں کا اپنا معاشی و تجارتی نظم و نسق ہو۔ مسلمان مدینہ منورہ پہنچے تو یہاں کی تجارت کا بڑا حصہ یہود کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں ان کا قینقاع نامی ایک بازار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا بھی اس بازار میں جانا اور یہود سے مالی معاملہ کرنا ثابت ہے۔ یہود کی تجارت صرف مدینہ منورہ ہی پر نہیں چھائی ہوئی تھی، بلکہ پورے حجاز میں پھیلی ہوئی تھی۔ مشہور یہودی سردار ابو رافع اثنا بڑا کاروباری آدمی تھا کہ ”حجاز کا تاجر“ کے لقب سے جانا جاتا تھا۔⁽³⁸⁾ تاہم ان کی تجارت اسلام کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ ان کی تجارت میں سود، جھوٹ، دھوکا، اجارہ داری اور ظلم سمیت مختلف اخلاقی برائیاں موجود تھیں، اس لیے آپؐ نے مسلمانوں کے لیے الگ جگہ منتخب فرمائی اور اسے ان کا بازار قرار دیا۔ ”وفاء الوفاء“ میں عطاء بن یسارؓ سے مروی ہے: ”رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے لیے ایک بازار قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو آپؐ بنو قینقاع کے بازار تشریف لے گئے۔ (لیکن وہ پسند نہ آیا) پھر مدینہ منورہ کے بازار کی جگہ آئے اور زمین پر پاؤں مبارک مارتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہے تمہارا بازار، جو کبھی تنگ ہو گا نہ اس میں محصول وصول کیا جائے گا۔“⁽³⁹⁾

یہ واحد بازار نہیں تھا، جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں قائم فرمایا، بلکہ ان کی تعداد ایک سے زائد تھی۔⁽⁴⁰⁾ البتہ بازار مدینہ کی خاصیت یہ تھی کہ یہ ایسے مقام پر قائم کیا گیا تھا، جہاں شہر کا مرکزی داخلی راستہ تھا کہ شام، مکہ مکرمہ اور یمن کے علاوہ جزیرہ عرب کے طول و عرض سے آنے والے اسی راستے سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ اس طرح کوئی بھی وفد، قافلہ، تاجر یا شخص مدینہ منورہ آتا، تو پہلے اس بازار سے گزرتا۔ یوں یہود کی تجارت کو مسلمانوں نے کافی گزند پہنچائی۔ اس بازار میں گندم، جو، خوردنی تیل، چربی، پنیر اور شہد سمیت ہر قسم کا غذائی مواد، چمڑا، چمڑا سازی کا سامان، پہنے کا کپڑا، گھریلو استعمال کا کپڑا، زیور، برتن، تلوار، نیزے و تیر سمیت ہر قسم کے ہتھیار، مویشی اور گھوڑے فروخت ہوتے تھے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کی خواتین بھی مختلف اشیاء کی تجارت کرتی تھیں، جو گھر سے گھر تک ہی منحصر تھی، جس میں عطر فروشی نمایاں تھی۔ جب کہ اہل مدینہ کا ایک بڑا طبقہ صرف یعنی منی چینجر کا کام بھی کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس بازار کے انتظام پر خصوصی توجہ دی گئی۔ آپؐ بذات خود اپنے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس کی خبر گیری فرماتے اور اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح قیمتوں کی نگرانی کی جاتی اور عوام کے مفاد میں ان کا تعین کیا جاتا۔ نیز ذخیرہ اندوزی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ ایسے اصول وضع کیے گئے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کو نقصان نہ

پہنچے۔ حلال اور حرام تجارتی اور لین دین کے معاملات بھی بیان کر دیے گئے تھے۔ ناپ تول اور معیار کی جانچ بھی کی جاتی تھی۔

بازارِ مدینہ میں نواحی علاقوں سے بھی تاجر اور عام لوگ خرید و فروخت کے لیے آتے تھے، اس لیے یہ ایک بڑی علاقائی منڈی بن گیا تھا۔ تاہم اہل مدینہ کی تجارت اسی تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس کا دائرہ بیرونی تجارت تک وسیع ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ شام و یمن اور شام و فارس کے تجارتی راستوں پر واقع تھا، اس لیے یہاں بیرونی تجارت کا نہ ہونا محال تھا۔ ایک صحابی ابو معلق انصاری رضی اللہ عنہ جرتھے اور ان کی تجارت دور دراز علاقوں تک وسیع تھی۔ دوسری جانب ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ سے آنے والے قریشی مہاجرین نے اپنا آبائی پیشہ ہی اختیار کیا، اور شام اور دیگر علاقوں کی جانب تجارتی سفر کرتے رہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ پہلے نعیمان اور سوہیل بن حرمہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ بصری کا تجارتی سفر کیا۔ مدینہ منورہ سے جانے والے تجارتی قافلوں میں بعض اوقات 450 تک لوگ ہوتے، جس سے اہل مدینہ کی بیرونی تجارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔⁽⁴¹⁾

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی تجارت کا فروغ

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کو مسلمانوں کا تجارتی مرکز بنایا۔ آپ کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مدینہ منورہ کی تجارتی حیثیت مستحکم بنانے کے لیے اسی نہج پر چلتے رہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی دیگر امور کی طرح تجارت کے معاملے میں ان کی پیروی کی اور مدینہ منورہ ہی نہیں دور دراز اسلامی اراضی میں اس کے فروغ کے لیے اقدامات کیے اور احکامات جاری کیے۔ انہوں نے مصر اور مدینہ منورہ کے درمیان تجارت کو مضبوط بنانے کے لیے دریائے نیل کو بحیرہ قلزم سے ملانے کے خلیج کھودنے کا حکم دیا۔ اس کے راستے مصر کا غلہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ آنا شروع ہوا، جس سے حجاز کی بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات پوری ہوئیں۔⁽⁴²⁾

مدینہ منورہ کے دارِ ہجرت بننے کے بعد مکہ مکرمہ کا تجارتی مقام رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا۔ پھر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں کئی نئے شہر مسلمانوں کی تجارتی منڈیاں بن گئے، جن میں اسکندریہ اور بصرہ سرفہرست تھے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں فتوحات نے اسلامی ریاست کی حدود چین سے لیبیا تک وسیع کر دیں اور اس پورے خطے میں بے مثال امن و امان قائم کیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تجارت دور دور تک پھیل گئی۔ نیز مسلمانوں نے مختلف اقوام کے ساتھ فروغِ تجارت کے لیے معاہدے کیے۔ مثلاً: عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں والی مصر عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح نے نوبہ (سوڈان) والوں کے ساتھ معاہدہ کیا کہ وہ غلام اور لونڈیاں لائیں گے، اور ان کے بدلے مسلمان انہیں اتان دیں گے۔⁽⁴³⁾

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان دارالحرب میں بھی تجارت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ ایک بار گورنر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مسلمان تاجر دارالحرب میں داخل ہوتے ہیں، تو ان سے نفع کا دسواں حصہ

ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اس پر امیر المؤمنین نے بھی دار الحرب کے کافروں کے ساتھ یہی معاملہ کرنے کا حکم دیا۔⁽⁴⁴⁾

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں تجارت کا فروغ اس حد تک ہو چکا تھا کہ مسلمان عربوں کے ان قدیم بازاروں اور میلوں کے محتاج نہیں رہے تھے، جو موسموں کی مناسبت سے لگائے جاتے تھے۔ عرب شام، عراق، ماورائے نہر اور افریقا کے بڑے بڑے شہروں میں آباد ہو گئے تھے، اور ان شہروں میں مستقل بازار موجود تھے، جن کی سرگرمیاں کبھی ماند نہ پڑتی تھیں۔ اس عرصے اور بعد میں مسلمانوں نے کوفہ، بصرہ، قیروان اور بغداد جیسے شہر بھی بسائے، جو تجارتی مراکز کے طور پر بھی جانے گئے۔ ان میں بندرگاہی شہر بصرہ کے بازار مرد کی شہرت سب سے زیادہ تھی۔⁽⁴⁵⁾

بنو امیہ کے دور میں بھی مسلمانوں کی تجارت رو بہ ترقی رہی۔ اس وقت کی منکشف دنیا میں مسلمانوں کی تجارت کے لیے بری اور بحری چلت پھرت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس تجارتی نقل و حرکت سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ دیگر سلطنتوں اور علاقوں کے تاجروں نے بلادِ اسلامیہ کا رخ کرنا شروع کر دیا، اور وہ بری و بحری راستوں سے اور زیادہ بین الاقوامی تجارت کرنے لگے۔ ساتھ ہی خلفائے بنی امیہ نے بازار اور تجارتی مراکز بنوائے۔ صرف دمشق میں سوق الصیقلہ، سوق الخالدیین، سوق ام حکیم اور سوق سعید بن عبد الملک سمیت کئی کاروباری مقام قائم ہوئے۔ یہ سلسلہ دار الخلافہ کے ساتھ دیگر علاقوں میں بھی جاری رہا، جیسے حیرہ میں سوق یوسف، کوفہ میں سوق اسد، جزیرہ میں سوق هشام العقیق اور رصافہ جو تجارتی قافلوں کے ملنے کا نقطہ تھا۔

امویوں نے بازاروں کے انتظام اور امور کی نگرانی میں بھی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی پیروی کی اور اس مقصد کے لیے ہر بازار پر حکام تعینات کیے۔ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ مشرق کے بازاروں کا چکر لگاتے اور حالات معلوم کرتے تھے۔ ولید بن عبد الملک نے خرید و فروخت کے معاملات میں تاجروں کو درپیش مشکلات حل کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ حجاج بن یوسف نے بطور گورنر عراق اپنی عمل داری میں مالی اور ناپ تول کے نظام میں اصلاحات کر کے تجارت میں اطمینان اور اعتماد کی فضا پیدا کی۔ زیاد بن ابیہ ہر جمعہ کو قیمتوں اور بازاروں سے متعلق حکام سے دریافت کرتا تھا۔⁽⁴⁶⁾

بنو عباس کے اولین خلفاء کے دور میں بھی تجارت کو خوب فروغ ملا اور انہوں نے اس کی جانب رغبت میں بہت اضافہ کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہر ممکن اقدام کیے۔ انہوں نے سڑکیں، راستے، کنویں، سرائے، سرحدی چوکیاں اور سمندری محافظ بیڑے بنوائے، جس کے باعث مسلمانوں کے قافلے خشکی پر اور تجارتی جہاز سمندروں میں بے خوف و خطر سفر کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی سلطنت کے وسط میں بغداد جیسا شہر بسایا، جو اپنے محل وقوع کے باعث دنیا میں پہلے درجے کی منڈی بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس میں بازار بنوائے، جو بعد میں شہر کے باہر منتقل کر دیے گئے۔ یہ درحقیقت ایک عالمی منڈی تھی، جہاں مختلف اصناف کے لیے الگ الگ

بازار تھے۔ دوسری جانب دمشق تھا، جو بنو امیہ کے دور میں دار الخلافہ رہا تھا۔ وہاں بھی تجارت کے لیے تمام اسباب و موافق فضا موجود تھی۔ یہ ایشیائے کوچک و دریائے فرات کے علاقے سے بلاد عرب و مصر آنے اور جانے والے قافلوں کا نقطہ اجتماع تھا۔

بنو عباس نے فرات سے ایک نہر کھودی، جو دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقے کو چیرتے ہوئے دجلہ کے کنارے آباد بغداد تک پہنچی۔ یہ نہر اتنی بڑی اور گہری تھی کہ اس میں فرات سے دجلہ تک کشتیاں چلتی تھیں۔ یوں ایشیائے کوچک، شام، بلاد عرب اور مصر کا نئے دار الخلافہ اور مرکزی منڈی سے رابطہ مزید آسان ہو گیا، جب کہ وسط ایشیاء کے قافلے بخاری اور فارس سے گزر کر آتے رہے۔ بغداد کے ساتھ بصرہ بھی اہم تجارتی مرکز تھا، بلکہ اسے بغداد کی تجارت کا دروازہ سمجھا جاتا تھا، کیوں کہ اس کے ساحل پر چین سے صحرائے اعظم تک کے دور دراز ممالک سے تجارتی سامان آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مشرق و مغرب کی تجارت کا سنگم بن گیا تھا۔

ادھر بحیرہ روم میں بھی مسلمانوں کی تجارت جاری تھی، جو انطاکیہ سے جبل طارق تک وسیع تھی اور اس سمندر میں تاجر 36 دن تک کا سفر کرتے تھے۔ جب کہ دوسری صدی ہجری میں عباسیوں ہی کے دور میں مسلمان تاجر بحری راستوں سے چین پہنچے۔ ان کی یہ آمد و رفت سیلان اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں خاص طور پر ملبار کے راستے سے ہوئی۔ ان کی پیش قدمی جاری رہی اور بعض کوریا اور مشرق بعید تک گئے۔ ہارون الرشید کے دور میں مسلمانوں کے بحری سفر ملایا تک شروع ہو چکے تھے۔⁽⁴⁷⁾

حواشی اور حوالہ جات

- 1۔ ہائینڈ، ولیم، تاریخ التجارة فی الشرق الادنی فی العصور الوسطی، ج 1، مترجم: رضا، احمد محمد، المدینۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، مصر، 1985ء، ص: 13، 14
- 2۔ یوسف الدین، ڈاکٹر محمد، اسلام کے معاشی نظریے، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، 1950ء، ص: 5
- 3۔ طقوش، ڈاکٹر محمد سہیل، تاریخ العرب قبل الاسلام، دار النفائس، بیروت، 2009ء، ص: 83 - 85
- 4۔ ایضاً، ص: 95 - 96
- 5۔ ایضاً، ص: 99
- 6۔ افغانی، سعید، اسواق العرب فی الجالیہ والا سلام، دار الفکر، بیروت، 1974ء، خلاصہ از ص: 46 - 55
- 7۔ ابن ہشام، عبدالملک حمیری، معافری، السیرۃ النبویہ، ج 1، مترجم: دہلوی، سید یاسین علی حسنی نظامی، ادارۃ اسلامیات، لاہور، 1994ء، ص: 74
- 8۔ ازرقی، ابوالولید محمد بن عبداللہ، اخبار مکہ، مکتبۃ الاسدی، مکہ مکرمہ، 2003ء، ص: 176
- 9۔ جاحظ، عمرو بن بحر، کتاب البلدان، مطبعۃ الحکومہ، بغداد، 1970ء، ص: 472
- 10۔ رازی، امام فخر الدین محمد بن عمر، تفسیر مفتاح الغیب، ج 32، دار الفکر، بیروت، 1981ء، ص: 106، 107
- 11۔ اسلام کے معاشی نظریے، محولہ بالا، ص: 50، 51
- 12۔ اسواق العرب فی الجالیہ والا سلام، محولہ بالا، ص: 113 - 116

- 13۔ اسلام کے معاشی نظریے، محولہ بالا، ص: 46
- 14۔ نعمانی، مولانا شبلی، سیرت النبی ﷺ، ج 1، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، 2012ء، ص: 135
- 15۔ بک، محمد الحضری، نورالیقین فی سیرۃ سید المرسلین ﷺ، دارالایمان، دمشق، 1988ء، ص: 17
- 16۔ بخاری، امام محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، ج 3، حدیث نمبر: 2262، دار طوق النجاة، بیروت، 1422ھ، ص: 88
- 17۔ السیرۃ النبویہ لابن ہشام، محولہ بالا، ص: 116 – 118
- 18۔ صدیقی، ڈاکٹر یاسین مظہر، معاش نبوی، کتب خانہ سیرت، لاہور، کراچی، 2015ء، ص: 57
- 19۔ سیرت النبی ﷺ، ج 1، محولہ بالا، ص: 146
- 20۔ شیبانی، امام احمد بن حنبل، مسند احمد، ج 24، حدیث نمبر: 15559، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، 1999ء، ص: 327
- 21۔ حلبی، نور الدین علی بن برہان الدین، انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون، ج 1، دار المعرفہ، بیروت، 1400ھ، ص: 181
- 22۔ کاندھلوی، مولانا دلریس، سیرت مصطفیٰ ﷺ، ج 1، مکتبہ الحسن، لاہور، ص: 126، 128، 137
- 23۔ سورہ فرقان، آیت: 7
- 24۔ ایضاً، آیت: 20
- 25۔ جاحظ، ابو عثمان عمرو بن بحر، مدح التجارۃ و ذم عمل السلطان، رسائل الجاحظ، ج 2، دار الہلال، بیروت، 2002ء، ص: 241، 242
- 26۔ علامہ ابن کثیر دمشقی نے امیہ بن ابی الصلت کے حالات زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے تھوڑے ہی عرصے قبل اس کے ابوسفیان بن حرب کے ساتھ پہلے شام اور پھر یمن کی جانب سفر تجارت کا طویل واقعہ لکھا ہے: ”میں مکہ واپس لوٹ آیا۔ میں اپنے گھر پر تھا کہ لوگ آنا شروع ہو گئے اور علیک سلک کے ساتھ اپنے سامان تجارت کا پوچھتے۔ یہاں تک کہ محمد بن عبد اللہ بھی تشریف لائے۔ اس وقت ہند میرے پاس ہی بیٹھی بچوں کو بہلا رہی تھی۔ انہوں نے مجھے سلام کیا اور خوش آمدید کہا۔ میرے سفر اور حضر کا دریافت کیا، لیکن اپنے سامان تجارت کا نہیں پوچھا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے ہند سے کہا کہ بخدا مجھے یہ شخص بہت پسند ہے۔ قریش میں جس کسی نے بھی میرے ساتھ سامان تجارت بھیجا، اس نے اپنے مال کا ضرور پوچھا، لیکن اس شخص نے ایسا نہیں کیا۔“ ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو، البدایہ والنہایہ، ج 1، مترجم: مغل، مولانا محمد اصغر، دار الاشاعت، کراچی، 2008ء، ص: 680
- 27۔ ابن قیم، حافظ ابو عبد اللہ محمد، زاد المعاد، ج 1، مترجم: جعفری، رکیس احمد، نفیس اکیڈمی، لاہور، 1990ء، ص: 171
- 28۔ الشافعی، محمد بن یوسف، سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، ج 2، وزارة الاوقاف، مصر، 1997ء، ص: 193
- 29۔ ابن حجر، احمد بن علی العسقلانی، اصحاب فی تمیز الصحابہ، ج 4، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص: 103
- 30۔ ابن عساکر، علی بن حسین الشافعی، تاریخ مدینہ دمشق، ج 22، دار الفکر، بیروت، 1995ء، ص: 161
- 31۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ مقرر ہونے کی اگلی صبح اپنے سر پر کپڑوں کی گھٹری رکھی اور بازار کو چل پڑے کہ انہیں فروخت کر سکیں۔ راستے میں عمر فاروق اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہما مل گئے۔ انہوں نے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ آپ کہاں چل دیے؟ آپ نے جواب دیا: بازار۔ دونوں نے کہا: آپ کو مسلمانوں کا حکمران بنایا گیا ہے اور آپ یہ کر رہے ہیں۔ اس پر آپ نے کہا: پھر میں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا۔ دونوں نے کہا: آپ ہمارے ساتھ چلیں کہ ہم آپ کا وظیفہ مقرر کریں۔ آپ ان کے ساتھ تشریف لے گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے لیے پو میہ بکری کا کچھ حصہ

اور ضرورت کے مطابق لباس مقرر کر دیا۔

ابن سعد، محمد بن سعد الزہری، الطبقات الکبیر، ج 3، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، 2001ء، ص: 168

32۔ تاریخ مدینہ دمشق، ج 44، محولہ بالا، ص: 6، 3

33۔ العسکری، ابوالہلال حسین بن عبداللہ، الاوائل، ج 1، دارالعلوم للطباعة والنشر، ریاض، 1981ء، ص: 51

34۔ صحیح بخاری، ج 3، حدیث نمبر: 2062، محولہ بالا، ص: 55

35۔ الطبقات الکبیر لابن سعد، ج 3، محولہ بالا، ص: 57

36۔ ایضاً، ص: 117

37۔ ابن عبدالبر، یوسف بن عبداللہ النمیری، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج 2، دارالحیئل، بیروت، 1992ء، ص: 514

38۔ اسلام کے معاشی نظریے، محولہ بالا، ص: 90

39۔ سہودی، نور الدین علی بن عبداللہ، وفاء الوفاء بانخبار دارالمصطفیٰ، ج 3، مؤسسۃ الفرقان، سعودی عرب، 2001ء، ص: 82

40۔ ایضاً، ص: 83

41۔ ابن ادریس، عبداللہ عبدالعزیز، مجتمع المدینہ فی عہد الرسول ﷺ، جامعۃ الملک السعود، ریاض، 1982ء، ص: 209 – 216

42۔ مقریزی، احمد بن علی عیدی، المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار، ج 3، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1998ء، ص: 252

43۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، مؤسسۃ المعارف، بیروت، 1987ء، ص: 331

44۔ قرشی، یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، دارالشروق، قاہرہ، 1987ء، ص: 188

45۔ اسواق العرب فی الجالیہ والاسلام، محولہ بالا، ص: 393

46۔ القواسمی، سحر یوسف، التجارة ودول الخلافة فی صدر الاسلام، مقالہ، جامعۃ النجاش، فلسطین، 1999ء، ص: 114، 121، بروکلین، کارل، تاریخ الشعوب

الاسلامیہ، مترجم: فارس، نبیہ امین، البعلبکی، منیر، دارالعلم للملایین، بیروت، 1968ء، ص: 146، 147

47۔ تاریخ التجارة فی الشرق الادنی، ج 1، محولہ بالا، ص: 43-49، حسن، حسن ابراہیم، تاریخ الاسلام؛ السیاسی والدینی والثقافی والاجتماعی، ج 2، دارالحیئل،

بیروت، 1996ء، ص: 255 – 285

ANALYSIS OF ARTICLES PUBLISHED IN THE INSTITUTE OF ISLAMIC RESEARCH MAGAZINE "FIKR O NAZAR" ON THE TOPICS OF MORAL ETHICS AND MORAL ETHICAL TRAINING.

ادارہ تحقیقات اسلامی کے مجلہ "فکر و نظر" میں اخلاق اور اخلاقی تربیت کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کا تجزیہ

عظمیٰ محمد یونس (ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک لرننگ، کلیہ معارف اسلامی، جامعہ کراچی)

ABSTRACT: Islam placed a high value on character building of an individual. The lifestyle of a human being is closely bound with ethical values unlike other organisms living on this planet. This highlights the importance of embracing ethics on our day today activities. In Arabic language word Tarbiyah is used for Ethical Training. Tarbiyah is from the root raba means to increase, to grow; which implies a state of spiritual and ethical nurturing in accordance with the will of God. Institute of Islamic Research as a pioneer of Islamic research Centre of Pakistan assigned the function of undertaking "Islamic research and instruction in Islam for the purpose of assisting in the reconstruction of Muslim society on a truly Islamic basis" under article 207 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1962. For the fulfillment of the assigned purpose institute is putting consistent efforts on the contemporary researches under the various disciplines of religion and social affairs. As the reconstruction of Muslim society under the truly Islamic basis is the prior objective of the said Institution. Therefore, the Urdu Monthly Research Magazine "Fikr o Nazar" is selected for the analysis of the subjects related to the Ethical Values and Character Building of an individual. This article is not only providing a detail account of "Central Institute of Islamic Research", but also presents the efforts of said Institution for promoting ethical values through its Urdu research Journal "Fikr o Nazr" as well as contains workable suggestion to effectively achieve the fixed desired goal as per the demand of contemporary era.

Keywords: Moral ethical training, Moral ethical values, Character building, Spiritual nurturing, Spiritual development.

پاکستان جب بحیثیت اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تب اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کا پہلا اہم مقصد مختلف انتظامی مسائل کا حل تھا۔ تاہم جو نہی انتظامی مشکلات اور دشواریوں کے بادل چھٹنا شروع ہوئے ویسے ہی حکمرانوں اور ارباب اقدار سمیت سنجیدہ فکر اور تعمیر و ترقی کے لئے متحرک طبقوں میں پاکستان کے آئینی ڈھانچے سے متعلق سوالات گردش کرنے لگے۔ چونکہ پاکستان کا قیام بطور اسلامی ریاست عمل میں آیا تھا اس لئے حکمران اور صاحب اثر افراد اس بات کے متمنی تھے کہ پاکستان کے آئین کی تشکیل اس طرح ہو کہ اس کے تمام تصورات اور دفعات اسلامی تعلیمات کے عکاس ہوں۔ چنانچہ ادارہ تحقیقات اسلامی اُسی حصے کی ایک کڑی بنا۔

میرا یہ تحقیقی مضمون ادارہ تحقیقات اسلامی کے مجلہ "فکر و نظر" میں اخلاق اور اخلاقی تربیت کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں "ادارہ تحقیقات اسلامی کا تعارف" جبکہ دوسرا حصہ "اخلاق اور تزکیہ نفس" سے متعلق ہے، تیسرے اور آخری حصہ میں "ادارہ تحقیقات اسلامی کے ماتحت اخلاق اور اخلاقی تربیت سے متعلق مضامین کا تجزیہ" پیش کیا گیا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کا قیام

قیام پاکستان کے دو سال بعد 9 مارچ 1949ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کا مسودہ پیش کیا، جسے 12 مارچ 1949ء کو منظور کر لیا گیا۔ اس قرارداد کی منظوری کے نتیجے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اغراض و مقاصد کا تعین کرنے کے لئے جو دفعات پیش کی گئیں وہ اسلامی اقدار کی عملی تعبیرات اور قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کی مکمل عکاسی کی متقاضی تھیں۔ قرارداد مقاصد کے تحت نوزائیدہ اسلامی ریاست پاکستان کے ریاستی مقاصد پر صحیح معنوں میں کاربند ہونے کے لئے ایک اسلامی تحقیقی ادارے کا قیام ناگزیر تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ایک ممتاز رکن چوہدری معظم حسین نے پاکستان میں ایک اسلامی تحقیقی ادارے کے قیام کی ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کرتے ہوئے نواب زادہ لیاقت علی خان کو 1951ء میں ایک اسلامی تحقیقی ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی۔ بعد ازاں یہ تجویز ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں 19 اپریل 1952ء میں آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوئی اور منظور ہو گئی۔

قرارداد کا متن درج ذیل ہے: "یہ اسمبلی قرار دیتی ہے کہ ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جس کا نام "تحقیقات اسلامی کا ادارہ" ہو۔ اپنے مختلف شعبوں اور شاخوں کے ساتھ اسے کراچی میں رکھا جائے۔ اس ادارے میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف میدانوں یعنی سماجی، اقتصادی، تاریخی، ثقافتی، آئینی، قانونی وغیرہ شعبوں میں تحقیقات کی جائیں۔ اور اسلام کے متعلقہ موضوعات اور مسائل پر اعلیٰ درجے کی تصنیفات تیار کی جائیں۔" (1)

اس قرارداد کی منظوری کے بعد "ادارہ تحقیقات اسلامی" کا قیام پاکستان کے پہلے تحقیقی ادارے کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ ابتداء میں یہ ادارہ کراچی کے علاقے عالمگیر روڈ بہادر آباد میں اپنے فرائض کی انجام دہی ایک عارضی تنظیم کے طور پر کرتا رہا۔ تاہم 10 مارچ 1960ء میں ایک رسمی اعلامیہ کے اجراء کے نتیجے میں اسلامی تحقیقات کی اس عارضی تنظیم کو باقاعدہ ادارے کی حیثیت سے ہمکنار کیا گیا۔ ادارے کے انتظام اور نگرانی کے لئے باقاعدہ بورڈ آف گورنرز کے ارکان کی نامزدگی ہوئی جس کے تحت ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا بطور ڈائریکٹر تقرر ہوا۔ جگہ کی تنگی کے پیش نظر اس ادارے کو پہلے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی اور پھر فاران ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی منتقل کیا گیا۔

ادارے کی منتقلی اور ماتحتی

باقاعدہ ادارے کی حیثیت ملنے کے بعد ابتداء میں اسلامی تحقیقاتی ادارہ وزارت تعلیم کے ماتحت کام کرتا رہا۔ 1966ء میں انتظامی سہولت کے پیش نظر وزارت قانون کے اصرار پر اس تحقیقاتی ادارے کو اسلام آباد منتقل کر دیا گیا، اور یوں اس ادارے کی ماتحتی وزارت قانون کو حاصل ہو گئی، تاہم 1972ء کے اواخر میں وزارت مذہبی امور کے قیام کے بعد یہ ادارہ اسی سے منسلک ہو گیا۔ ادارے کی طرف سے سب سے پہلے انگریزی سہ ماہی مجلہ "اسلامک اسٹڈیز" 1962ء میں شائع ہوا۔ اپنے گراں مایہ تحقیقی و علمی مقالات کے سبب اس مجلے نے علمی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ اسی سہ ماہی انگریزی مجلہ کے ساتھ ساتھ ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف سے اگست 1963ء میں ایک ماہنامہ "فکر و نظر" کے نام سے کراچی سے جاری کیا گیا۔ مجلہ فکر و نظر کی اشاعت کا مقصد ہندو پاک کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسلامی افکار و تعلیمات سے آگاہی فراہم کرنا تھا۔

ادارے کے ماتحت دیگر مجلات

1965ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے توسط سے ایک عربی مجلہ "الدراسات الاسلامیہ" بھی کراچی سے ہی شائع ہوا۔ ادارے کی اسلام آباد منتقلی کے وقت جگہ کی دستیابی میں دشواری کی بنا پر شروع میں ادارہ تحقیقات اسلامی کا دفتر لال کھڑی راولپنڈی میں قائم کیا گیا۔ چنانچہ جون 1967ء سے ستمبر 1967ء تک مجلہ "فکر و نظر" بشمول دوسرے مجلات کے کچھ شمارے لال کھڑی راولپنڈی سے شائع ہوئے۔ کچھ عرصے بعد ادارہ تحقیقات اسلامی کا نیا دفتر میلوڈی اسلام آباد میں قائم کیا گیا تو اگلے تیرہ سال تک "مجلہ فکر و نظر" اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے دوسرے مجلات میلوڈی اسلام آباد سے شائع ہوتے رہے۔

بعد ازاں 1980ء میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا قیام عمل میں آیا جو ایک کامیاب تہذیبی منصوبہ ہے۔ اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد علمی تحقیق کی حوصلہ افزائی اور اس میں امتیازی مقام حاصل کرنا ہے۔ نیز اقوام عالم میں امت مسلمہ کا مقام بلند کرنے اور انسانی معاشرے میں بحیثیت مجموعی مثبت طور پر حصہ لینے کے لیے ان تمام امور اور اسلام کی اصلی تعلیمات و اقدار کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر امت مسلمہ معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکے۔

مجلہ فکر و نظر کے موضوعات

ادارہ تحقیقات اسلامی اور اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے مقاصد میں مماثلت کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی کو اسلامی یونیورسٹی کے ماتحت کر دیا گیا۔ چنانچہ اس وقت "مجلہ فکر و نظر" بشمول ادارہ تحقیقات اسلامی کے دیگر مجلات انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے فیصل مسجد کیمپس سے شائع ہو رہے ہیں اور اب تک اس یونیورسٹی کی ماتحتی میں ان مجلات کی پابندی کے ساتھ اشاعت جاری ہے۔ مجلہ فکر و نظر میں قرآن و حدیث، فقہ، علم الکلام اور تصوف جیسے علوم کے علاوہ تاریخ اسلام، تعلیم و تدریس، تقابل ادیان، سائنس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، ثقافت و تمدن، اصول قانون اور معاصر افکار پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت پر مبنی تحقیقی مقالات

اور مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ نیز علوم اسلامیہ پر شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف و تبصرہ بھی فکر و نظر کا مستقل جز ہے۔

ادارے کی بنیادی ترجیحات اور مقاصد

مجلہ فکر و نظر 1963ء سے تاحال ادارہ تحقیقات اسلامی کی اردو میں ترجمانی کر رہا ہے۔ اسلامی تحقیق کے اس ادارے کی بنیادی ترجیحات مختلف ادوار میں مختلف رہیں۔ جن کی وضاحت ذیل میں بیان کی جا رہی ہے:

❖ قیام کے بعد ابتدائی دو سال (1953ء تا 1952ء) تک اس ادارے کی اولین ترجیح اسلامی طرز زندگی کی ترویج کے لئے اعلیٰ درجے کی تحقیقات کے لئے فکری رہنمائی فراہم کرنا تھا۔

❖ 1954ء میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ضرورت کے پیش نظر اس ادارے نے عبدالعزیز میمن کی سرپرستی میں انہی مقاصد کے حصول کیلئے متحرک ہو گئی، البتہ ادارے کی اپنی ترجیحات اور منہج اب بھی مبہم تھے۔

❖ 1956ء میں وزارت کی پیش کردہ سفارش کے بعد اس تحقیقی ادارے کی حیثیت "ادارہ برائے اسلامی تحقیق و ہدایت برائے اعلیٰ تعلیم کی تنظیم" کی ہو گئی۔ اس طرح ادارے کا کام مسلم معاشرے کی صحیح اسلامی خطوط پر تشکیل نو میں معاونت فراہم کرنا ہو گیا اور ادارہ ترجیحی بنیاد پر اسی امر کی تعمیل و تکمیل کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ یہ ترجیحات اس زمانے کی ہیں جب تحقیقات اسلامی کا ادارہ ایک عارضی تنظیم کے طور پر کام کر رہا تھا۔

❖ 1960ء میں جب اس ادارے نے عارضی تنظیم سے باقاعدہ ادارے کی حیثیت حاصل کر لی، اس وقت بورڈ آف گورنرز کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے چیئرمین بورڈ حبیب الرحمن صاحب نے اس ادارے کی ترجیحات و مقاصد کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں اس طرح بیان کی: "ادارے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر اس انداز سے پیش کرے کہ یہ ایک ایسا نظام حیات ثابت ہو سکے جو موجودہ دور کے چیلنج کا سامنا کر سکے اور موجودہ سائنسی دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اور ادارے کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو گی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو عقلی، قابل فہم اور لبرل انداز میں پیش کر سکے۔" (2)

ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا رسمی اعلامیہ جو وزارت تعلیم کی طرف سے جاری ہوا تھا اس میں ادارے کے مقاصد کی وضاحت درج الفاظ میں بیان کی گئی تھی: "اسلام پر تحقیقات کو منظم شکل دینے کے لئے اور موجودہ دور میں اسلام کی عقلی اور سائنٹفک تعبیر کے لئے اور تاریخ، فلسفہ، سائنس اور ثقافت کے میدانوں میں مسلمانوں کے کارناموں سے روشناس کرانے کے لئے صدر مملکت مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔" (3)

ادارے کے چار مقاصد بطور رہنما اصول

ادارے کے رسمی قیام کے بعد ادارے کی تحقیقی ترجیحات کے تعین کے لئے چار مقاصد بطور رہنما اصول متعین کئے گئے۔ ان اصولوں کے تعین کے تحت ادارے کی تحقیقاتی جہت کی واضح طور پر نشاندہی ہو گئی۔ تحقیق کے ضمن میں ادارہ جن چار متعین کردہ

اصولوں کی پیروی کرتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

- ۱۔ اصول اور کلیات کی روشنی میں اسلام کی عقلی تعبیر پیش کرنا اور دیگر باتوں کے علاوہ اسلام کے بنیادی تصورات مثلاً عالمی اخوت، رواداری اور سماجی انصاف پر زور دینا۔
- ۲۔ اسلام کی تعلیم کو اس انداز میں پیش کرنا کہ موجودہ زمانے کی ذہنی اور سائنسی ترقی کے پس منظر میں اسلام کا عملی کردار نمایاں ہو سکے۔

۳۔ فکر انسانی، سائنس اور تہذیب و ثقافت کو آگے بڑھانے میں اسلام نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، تحقیق کے ذریعے اس کو منظر عام پر لانا تاکہ مسلمان ان میدانوں میں دوبارہ نمایاں مقام حاصل کر سکیں۔

۴۔ اسلامی تاریخ، فلسفہ، قانون اور اصول قانون وغیرہ میں تحقیق کے کام کی تنظیم، اور حوصلہ افزائی کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کرنا۔⁽⁴⁾

ادارے کے شعبہ جات

اگرچہ اسلامی تحقیقاتی ادارے کی ترجیحات میں مختلف ادوار میں مختلف رجحانات کا اثر غالب رہا البتہ تحقیقی ضمن میں ادارے کا مقصد اصلی "اسلامی اقدار کی عملی تعبیرات اور قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی عصر حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مکمل عکاسی" اپنی جگہ برقرار رہا۔ البتہ تحقیقی اصولوں کی بامقصد تکمیل اور تحقیقی عمل کو منظم رکھنے کے لئے ادارہ درج ذیل شعبہ جات میں منقسم ہے:⁽⁵⁾

- | | |
|--|------------------------------|
| ۱۔ القرآن (تفسیر، علوم القرآن) | ۸۔ معاشیات و معاشی ترقی |
| ۲۔ السنۃ | ۹۔ عالم اسلام کے مسائل حاضرہ |
| ۳۔ قانون و اصول قانون (فقہ و اصول فقہ) | ۱۰۔ حوالہ و استفسار |
| ۴۔ سیرت و تاریخ | ۱۱۔ تراجم |
| ۵۔ فقہ جعفری اور فارسی ادبیات | ۱۲۔ عربی زبان و ادب |
| ۶۔ عمرانیات | ۱۳۔ مطالعہ تقابل ادیان |
| ۷۔ تاریخ و فلسفہ و سائنس | |

ادارہ تحقیقات اسلامی ان منظم شعبوں کے توسط سے آج بھی اپنے قیام کے مقصد کے حصول کے لئے پرعزم ہے اور تحقیقی منہج پر اپنا فرض بخوبی ادا کر رہا ہے۔

لفظ اخلاق کے لغوی و اصطلاحی مفہوم

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامی اقدار کی عملی تعبیرات کے لئے اخلاقی اقدار کی ترویج ایک لازمی جز ہے۔ لغت کے اعتبار سے اخلاق "خُلُق" کی جمع ہے۔ اس کا مادہ (خ۔ل۔ق) ہے۔ اگر لفظ "خ" کے اوپر "زبر" پڑھیں تو اس کے معنی ہیں ظاہری شکل و صورت اور اگر لفظ "خ" کے اوپر "پیش" پڑھیں تو باطنی اور داخلی و نفسانی شکل و صورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں انسان خُلُق و خُلُق دونوں اعتبار سے نیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ظاہری صورت بھی اچھی ہے اور باطنی صورت بھی۔ جیسا کہ امام راغب اصفہانی "معجم مفردات الفاظ قرآن" میں بیان فرماتے ہیں: الخلق والخلق: فی الاصل واحد کا الشرب والشرب لكن خُصَّ الخلق بالهيات والصور المدركة بالبصر وخُصَّ الخلق بالقوى والسجایا المدركة بالبصيرة۔^(۶) "یعنی خلق اور خُلُق دراصل ایک ہی ہیں لیکن خلق مخصوص ہے ظاہری شکل و صورت سے اور خُلُق کو مخصوص کر دیا گیا باطنی اور معنوی شکل و صورت سے۔"

جبکہ لغت عرب میں لفظ تربیت کے کئی معانی ذکر کئے گئے ہیں۔ جیسے مکمل کرنا، اصلاح کرنا، پرورش کرنا۔^(۷)

راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے: "تربیت کا مصدر "رب" ہے اور اس کا مطلب کسی چیز کو مرحلہ وار اگانا، نشوونما دینا اور اس طرح اس کی پرورش کرنا ہے کہ وہ چیز اپنے کمال کو پہنچ جائے۔^(۸) اصطلاح میں تربیت اصطلاح میں اس عمل کو کہتے ہیں کہ انسان میں پائی جانے والی لاتعداد صلاحیتیں اس طرح سے پرورش پائیں اور نکھریں کہ وہ انسان کی ذات کمال تک پہنچ جائے۔" اس تعریف کی رو سے اخلاقی تربیت سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کو ایسے ماحول اور ایسے حالات میں رکھا جائے کہ اس کی قابلیت نکھر کر سامنے آئے اور اس کی صلاحیتوں کی اس قدر پرورش ہو کہ وہ انسان کامل بن جائے۔ الغرض اخلاقی تربیت سے مراد پسندیدہ اخلاقی صفات و کردار کے حصول میں باطنی صلاحیتوں کو پرورش دینا، بلند اخلاقی فضائل کو حاصل کرنا اور برائیوں سے پرہیز اور ان کو نابود کرنا ہے۔ اس بناء پر تربیت اخلاقی کا اہم کام، اخلاقی صلاحیتوں کو پیدا کرنا اور اخلاقی کمالات تک پہنچنا ہے۔

تمام مخلوقات میں انسان کی تربیت سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ انسان ہی روئے زمین کا واحد فرد ہے جس پر زمین کی صلاح و فساد کا انحصار ہے۔ اس انسان کو اللہ نے ارادہ و اختیار کا مالک بنا کر دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز بنایا اور اُس کو خیر و شر، نیکی و بھلائی کی راہ دکھانے کے لئے کتاب بھی دی اور انبیاء کرام کا سلسلہ بھی جاری کیا جو آدم سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا۔ انسان کی نسلوں کو اسی اعتبار سے تربیت کے لمبے عرصے اور مرحلوں سے گزرنے کی تلقین اور تعلیم تمام ادیان میں اور تہذیبوں میں ملتی ہے۔ کیونکہ اس انسان کے اعمال پر اس دنیا میں امن یا فساد، نیکی یا برائی، محبت یا نفرت کا دار و مدار ہے۔ انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے ازلی ابدی سلسلہ ہدایت کی آخری کڑی قرآن پاک اور حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ اس عظیم ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے طریقہ کار کے لئے رہنمائی فرمائی کہ انسان کس طرح اپنی آنے والی نسلوں کو خود ان کے لئے اور تمام انسانیت کے لئے مفید اور باعث خیر بنائے۔

اخلاق اور تزکیہ نفس کا ربط

اخلاقی تربیت کے لئے تزکیہ نفس لازم و ملزوم ہے، کیونکہ تزکیہ کا لفظی معنی ہی "پاک صاف کرنا، نشوونما دینا" کے ہیں۔ اسی سے لفظ زکوٰۃ نکلا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ۔^(۹) "بیشک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا۔"

لہذا تزکیہ نفس سے مراد ہے کہ نفس انسانی میں موجود شر کے فطری غلبہ کو دور کرنا اور اسے گناہوں کی ان آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کرنا جو کہ روحانی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ ان تمام بدی کی خواہشات پر غلبہ پالینے کا عمل تزکیہ نفس کہلاتا ہے۔ تزکیہ کے اسی عمل کو قرآن مجید نے فلاح یعنی کامیابی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا۔^(۱۰) "ی قینا وہ مراد کو پہنچا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اسے خاک میں ملا دیا۔"

اللہ رب العزت نے نبی کریم ﷺ کو بھی اسی خاص مقصد کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ وَأَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔^(۱۱) "وہی ذات (اللہ) ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

اسی طرح عیال اللہ سے مخاطب ہو کر قرآن مجید میں بعثت نبوی ﷺ کے مقاصد درج ذیل الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں: لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔^(۱۲) "بیشک اللہ نے مومنوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات پڑھتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

مندرجہ بالا ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف علوم اسلامی کی تعلیم ہی نہیں تھا بلکہ اخلاقی تربیت کی ترویج کے ذریعے افراد اسلامی کو تمام الہامی احکام کی تعمیل پر کاربند بھی کرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ بھی ضروری قرار دیا گیا۔

درحقیقت ذات انسانی بدون اخلاقی تربیت اس پھول کے مماثل ہے جس کی بناوٹ تو حسین ہو لیکن اس میں مسکور کرنے کی تاثیر یعنی خوشبو نہ ہو۔ اخلاقی تربیت و تزکیہ تمام اسلامی اعمال کی روح ہے۔ تزکیہ نفس ہی درحقیقت انسان کو منفی اثرات سے نجات دلانے کا آلہ ہے۔ یہی وہ ہتھیار ہے جو انسان کو مثبت سوچ اور اعمال صالحہ کی طرف راغب کرتا ہے بلکہ ان کی نشوونما میں بھی معاون کا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر حیات انسانی پر غور کیا جائے تو نئی نسل کی ذہن سازی اور کردار سازی پیدائش کے وقت سے ہی نومولود کے ایک

کان میں تکبیر اور دوسرے میں اقامت کے ذریعہ شروع ہو جاتی ہے۔

اخلاقی تعلیم اور تربیت کا سلسلہ جو ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اس کا پہلا عکاس گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے بعد تربیت انسانی کا محور مکتب ہوتا ہے اور پھر معاشرے کا بیرونی ماحول ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی نہ صرف آداب اور اخلاق سے پُر اور بد اخلاقی، فحش و منکرات سے پاک معاشرہ کی تعمیر پر زور دیتی ہے بلکہ ایسے معاشرے کے قیام کو امت مسلمہ کے اجتماعی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اور فرض قرار دیتی ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کے ماتحت اخلاق اور اخلاقی تربیت سے متعلق مضامین کا تجزیہ

اسلامی معاشرہ آج جن مسائل سے دوچار ہے ان تمام مسائل کی جڑ حقیقت میں اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس کا فقدان ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی معاشرے کی اسلامی تعبیرات کے مطابق تشکیل نو کا نہ صرف خواہاں ہے بلکہ اس مقصد کے حصول کے لیے گزشتہ چھ دہائیوں سے حالات اور ضرورت کے پیش نظر اپنے مجلات کے توسط سے اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم ادارہ تحقیقات اسلامی کے ماتحت اخلاق اور اخلاقی تربیت سے متعلق شائع ہونے والے مضامین کا تجزیہ پیش کرنے کی سعی کر رہے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا مضمون: بعنوان "قرون اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد کا اسلام: اخلاقی اصول"

ادارہ تحقیقات اسلامی 1960ء میں باقاعدہ تنظیم کی صورت میں منظر عام پر آیا، جبکہ مجلہ فکر و نظر کے پہلے شمارے کا باقاعدہ اجراء اگست 1963ء میں ہوا۔ دیگر عصری مسائل پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ ادارے نے اپنے ارد و مجلے کے اجراء کے اگلے سال ہی 1964ء میں مجلے کی جلد 1، شمارہ نمبر 10 میں اخلاقیات کے موضوع پر مضمون بعنوان "قرون اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد کا اسلام: اخلاقی اصول" شائع کیا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے ان تمام حالات و واقعات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جو اخلاقی سطح پر، انسانی ارادہ و اختیار اور جواب دہی کے ضمن میں، قرون اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد کے زمانے میں امت مسلمہ پر گزرے۔

ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے اس مضمون میں اس حقیقت کو جلا بخشی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کامیاب زندگی کا لائحہ عمل قرآن مجید کے ارشادات اور نبی آخر الزماں ﷺ کے اسوہ حسنہ میں موجود ہے۔ ایک ایسا لائحہ عمل جس پر گامزن ہو کر انسانی توانائی کے اعلیٰ تخلیقی مضمرات بروئے کار لائے جاسکتے ہیں اور ان تخلیقی کوششوں کو صحیح اخلاقی نہج پر رکھنا بھی عین ممکن ہے۔ تاہم قرون اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد ان تمام اخلاقی اقوال و اعمال کی صورت تو باقی رہی لیکن ان کی خاصیت میں دوسرے رجحانات کی آمیزش سے ان کی جاذبیت اور تاثیر جاتی رہی۔ مسلمانوں کے لئے قرون اولیٰ میں متعین کردہ اخلاقی اصولوں پر قرون اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد فرقہ واریت کے نتیجے میں اجتماعی خرابی کا جو مخصوص اور انتہا پسندانہ حل نکالا گیا وہی مسلمانوں کے افکار و عقائد کی مستقل خصوصیت بن گیا اور ضرورت وقت اور حالات کے ساتھ اس انتہا پسندی کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا کہ اس نے اسلام کے اخلاقی اصولوں کی اصلی صورت مدہم

کردی۔ اس بات کی توثیق کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریر میں امام ابن تیمیہؒ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے: "جاننا چاہئے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں متکلمین اور متصوفین کے بہت سے گروہوں نے لغزش کھائی ہے۔ اور اس معاملے میں وہ معتزلہ اور ان جیسے دوسرے قدریوں سے بدتر عقیدے کے قائل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ معتزلہ اور ان کے ہم عقیدہ قدری اور امر و نہی، جنت کے وعدوں اور دوزخ کی وعید، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے اصولوں کی عظمت برقرار رکھتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل ہیں۔ البتہ تقدیر کے معاملے میں یہ گمراہ ہو گئے اور اس امر کے معتقد ہوئے کہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیت عامہ، قدرت شاملہ اور ہر شے کو اپنے احاطہ میں لینے والی خالقیت کا اثبات کیا تو اس سے خدا تعالیٰ کے عدل اور حکمت کو عیب لگے گا۔ لیکن اس معاملے میں وہ غلطی پر تھے۔ ان کے مقابل علماء، عابدوں، اہل کلام اور صوفیاء کی ایک جماعت کھڑی ہو گئی۔ جنہوں نے عقیدہ قدر کا اثبات کیا اور اس پر ایمان لائے کہ اللہ ہر شے کا رب اور مالک ہے اور وہ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا اور وہ ہر شے کا خالق ہے۔ یہ اچھا اور صحیح عقیدہ ہے، لیکن انہوں نے امر و نہی، جنت کے وعدوں اور دوزخ کی وعیدوں کے بارے میں کوتاہی برتی۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض غلو کر کے الحاد میں گرفتار ہو گئے۔ اس طرح وہ مشرکوں کی جنس میں شامل ہو گئے جن کا یہ کہنا ہے کہ "اگر اللہ نہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے آباء و اجداد شرک میں مبتلا ہوتے۔ نہ ہم کسی حلال چیز کو حرام کہتے (قرآن)۔" قدریہ تو مجوس سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ جسے شر سمجھتے ہیں اس کا فاعل وہ غیر اللہ کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ لوگ ان مشرکوں کے مشابہ ہیں جن کے بارے میں قرآن کی محولہ بالا آیت نازل ہوئی۔ چونکہ مشرک مجوس سے بدتر ہیں (اس لئے یہ لوگ قدریہ سے گئے گذرے ہیں)۔" (13)

اس حوالے سے محقق رقمطراز ہیں: "ان تمام خرابیوں کے بعد سترھویں اور اٹھارویں صدی کے جمہتدین الترتیب شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر امت کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔ ان مصلحین نے اپنے اپنے زمانے میں اس اصلاح کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں لیکن پھر بھی مسلمانوں کی عملی زندگی عقیدہ جبریت کے ہاتھوں مفلوج رہی۔" (14)

ادارے کی طرف سے شائع ہونے والا یہ مضمون انتہائی اہم نکات کو سمجھائے ہوئے ہے۔ اگر امت مسلمہ واقعی اپنی کھوئی ہوئی اخلاقی قدروں کا احیاء چاہتی ہے تو اسے تمام فرقہ واری اختلافات کو بالائے طاق کر کے اسی پلیٹ فارم پر متحد ہونے کی ضرورت ہے جو آپ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی ریاست میں تعمیر کیا تھا۔ افراد کے اخلاقی اقدار بلند تھے جس کے باعث بین المذاہب اتحاد کی وہ نظیر قائم ہوئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی اتحاد کی برکت تھی کہ مٹھی بھر مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے مشرق و مغرب کی سلطنتوں کے سلطان بن گئے۔

دوسرا مضمون: بعنوان "علوم جدید اور اخلاق و مذہب"

ادارے کی طرف سے اخلاق و مذہب پر دوسرا مقالہ 1965ء کی جلد 2، شمارہ نمبر 7 میں بقلم حبیب اللہ ندوی صاحب بعنوان "علوم جدید اور اخلاق و مذہب" شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصنف نے تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کی ضرورت اور اہمیت پر بھرپور

انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر انہوں نے احکام کی تبدیلی کا اصول بھی قلمبند کیا ہے۔ صاحب مضمون فرماتے ہیں: "زمانے کی تبدیلی اور رجحانات سے اصول صلی کی صحت متاثر نہیں ہوتی بلکہ قیاسی اور اجتہادی اصول میں رد و بدل کی جاتی ہے اور یہ رد و بدل مصالح و مصلحت کے زمرے میں آتی ہے۔ ان تبدیلیوں اور رد و بدل کا تعلق کہیں سے بھی دینی معاملات میں سستی، عادتوں کے بگاڑ احتیاط کی کمی اور حرص کی زیادتی سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اخلاقی انحطاط کی پیداوار ہے جس کا فرد خود ذمہ دار ہے۔" (15)

مجلے میں شائع ہونے والا یہ مضمون عظیم نفع پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون اس بات کو بخوبی واضح کر رہا ہے کہ شریعت کی بنیاد افراد کے معاد و معاش کے بہترین مصالح پر ہے۔ ایسے قوانین جو افراد کے لئے بجائے نفع کے فساد کا باعث بنیں یا حکمت کے بجائے عبث بن جائیں یا فرد کے اخلاقی انحطاط کا باعث بنیں ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تیسرا مضمون: بعنوان "ہماری اخلاقی پستی کے اسباب اور اس کا علاج"

اخلاق کے موضوع پر تیسرا مضمون 1965ء ہی کی جلد 3، شمارہ نمبر 2 میں بقلم ڈاکٹر فضل الرحمن شائع ہوا۔ اس مضمون کا عنوان "ہماری اخلاقی پستی کے اسباب اور اس کا علاج" تھا۔ اس مضمون میں مصنف کی بہت عمدہ طریقے سے پاکستان کے مسلمانوں میں اخلاقی پستی اور اخلاقی و روحانی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی مصنف نے بااخلاق شخصیت کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل بھی وضع کیا ہے جس میں درج ذیل چار اداروں کا کردار مطلوب ہے: (16)

۱۔ والدین کی تربیت اور گھر کا ماحول

۲۔ مکتب کا ماحول (خواہ دینی مدرسہ ہو یا اسکول)

۳۔ دینی قیادت کا مثبت کردار

۴۔ بنیادی جمہوریتوں اور مذہبی افراد کا بطور عضوی وحدت اخلاقی اور سماجی مسائل کے حل میں مثبت کردار۔

اخلاقی پستی سے نجات کے لئے مضمون میں پیش کردہ لائحہ عمل قابل عمل بھی ہے اور قابل نفاذ بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ افراد معاشرہ کو متحد ہونا پڑے گا اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی اور ملی مفاد پر ترجیح دینی ہوگی۔ یہی وہ واحد صورت ہے جس کے تحت اخلاقی اقدار کا احیاء ممکن ہے۔

چوتھا مضمون: بعنوان "قرآن و سنت میں اخلاق"

1966ء میں مجلہ "فکر و نظر" کی جلد 4، شمارہ نمبر 3 میں اخلاق کے موضوع پر "قرآن و سنت میں اخلاق" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے قرآن و سنت کی روشنی میں اخلاق کی مکمل توضیح کے ساتھ اخلاقی تربیت کے محصولات اور ثمرات کے ذریعے انسان کی زندگی میں اخلاق کی اہمیت کو مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ (17)

مصنف نے جو نکات قرآن و سنت کے حوالے سے اس مضمون میں پیش کئے ہیں یہ وہی اخلاقی اصول ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے پہلی اسلامی ریاست کے تمام شعبوں میں نافذ فرمایا۔ نیز ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں مسلمانوں نے جو ثمرات حاصل کئے وہ بھی اقوام عالم کے سامنے موجود ہیں۔ عصر حاضر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنی کامیابیوں کو بجائے دوسری تہذیبوں کے اپنے آثار و تمدن میں تلاش کریں تو تمام معاشرتی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

پانچواں مضمون: بعنوان "اخلاق اور اسلامی معاشرہ"

اخلاقیات کے موضوع پر ادارہ تحقیقات اسلامی کے مجلہ "فکر و نظر" میں ڈاکٹر عبد الرحمن شاہ ولی کا مضمون "اخلاق اور اسلامی معاشرہ" 1972ء کی جلد 9، شمارہ نمبر 8 میں شائع ہوا۔⁽¹⁸⁾

اس مضمون میں ان اخلاقی اقدار کی وضاحت کی گئی ہے جس پر ایک حقیقی اسلامی ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ درحقیقت یہی وہ اقدار ہیں جو معاشرے میں امن کے ضامن اور اخوت و مساوات کے حصول کا سرچشمہ اور صفات الہی کے مظہر ہیں۔ مصنف اس مضمون کے توسط سے اس حقیقت سے متفق نظر آتے ہیں کہ معاشرے کی تمام خرابیوں کا بنیادی سبب اخلاقی اقدار کا انحطاط ہے۔

چھٹا مضمون: بعنوان "نظام اخلاق قرآن کی روشنی میں"

ادارے کے اردو مجلے "فکر و نظر" میں 1977ء میں جلد 15، شمارہ نمبر 1 میں بشیر احمد صدیقی صاحب کا مضمون "نظام اخلاق قرآن کی روشنی میں" شائع ہوا۔⁽¹⁹⁾

اس مضمون میں بھی اخلاق کی توضیح اور اخلاقی اقدار کی اہمیت بحوالہ قرآنی بیان کی گئی ہے۔ درحقیقت ایک ہی موضوع کو دو قناؤں میں تکرار کے ساتھ شائع کرنا اس ادارے کا خاصہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ادارے کو تفویض کردہ وہ ذمہ داری ہے جس کے تحت ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا یعنی اسلامی اقدار کی عملی تعبیرات اور قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی عصر حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مکمل عکاسی کرنا ہے۔

ساتواں مضمون: بعنوان "نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم اخلاق"

اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ادارے نے اسی مجلہ فکر و نظر میں 1980ء کی جلد 17، شمارہ نمبر 8 میں "نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم اخلاق" شائع کیا۔ جسے پیر محمد کرم شاہ صاحب نے تحریر کیا تھا۔⁽²⁰⁾

مصنف نے اس مضمون میں تمام انبیاء کے اقدار عالی کے بیان کے ساتھ ان اخلاقی اقدار کی ترویج کے لئے سابقہ انبیاء کی کوششوں کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ کی ذات کی بحیثیت معلم اخلاق مفصل انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ جس کا مقصد امت کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ کیا "کنی تم خیر امہ" کے قائل فی الواقع "خیر امہ" کا عملی مظہر ہیں؟

آٹھواں مضمون: بعنوان "اسلام کی اخلاقی تعلیمات"

ادارے نے اسلام کی عملی تعبیر کی عکاسی میں اخلاق کی اہمیت کے پیش نظر 1982ء کی جلد 20، شمارہ نمبر 2 میں محمد عبداللہ سلیم کا تحریر کردہ مضمون بعنوان "اسلام کی اخلاقی تعلیمات" شائع کیا۔ جس میں اخلاق کی حقیقت کی بحوالہ قرآن و سنت وضاحت کے بعد مراتب اخلاق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نیز مصنف نے خلاصے کے طور پر اصول اخلاق کو درج ذیل چار نکات میں سمولیا ہے:

۱۔ اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان۔

۲۔ فکر آخرت اور وہاں کی جواب دہی اور اپنی مسؤولیت کا احساس۔

۳۔ اپنے کو برتر اور دوسرے کو کم تر نہ سمجھنا۔

۴۔ باہمی اخوت پر اس طرح عمل کرنا کہ اپنے مفاد کی طرح ہی دوسروں کا مفاد عزیز ہو۔⁽²¹⁾

نواں مضمون: بعنوان "نبی اکرم ﷺ کا اخلاق حسنہ"

اس کے بعد 1984ء میں مجلہ "فکر و نظر" کی جلد 21، شمارہ نمبر 7 میں ضیاء الحق صاحب کا مضمون "نبی اکرم ﷺ کا اخلاق حسنہ" شائع ہوا۔⁽²²⁾ اس مضمون میں بھی مصنف نے اخلاق کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سابقہ انبیاء کے اخلاقی اقدار کے اجمالی بیان کے بیان پر آپ ﷺ کے ان اوصاف اور اخلاقی اقدار کو بیان کیا ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ نے مکارم الاخلاق کی تکمیل کر دی۔ اخلاق اور اخلاقی تعلیمات سے متعلق مذکورہ بالا مضمون مجلہ "فکر و نظر" کا آخری مضمون تھا۔ تاہم اس کے بعد جو مضامین اخلاقی اقدار کی ترویج اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے بطور تجویز پیش کئے گئے وہ تعلیم کے ساتھ تربیت کے ربط سے مربوط کئے گئے۔ چونکہ مقالہ اخلاق اور اخلاقی تربیت سے متعلق مضامین کا احاطہ کرتا ہے اس لئے تعلیم و تربیت سے متعلق مضامین تجزیے میں شامل نہیں کئے گئے۔

خلاصہ بحث

مندرجہ بالا تمام بحث اور تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی نے انسان کی ذاتی تربیت اور اسلامی اقدار کی عملی تعبیر کی عکاسی کے لئے جو کوشش کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان کی اولین حیثیت ایک فرد کی سی ہے اور افراد کے مجموعے سے معاشرہ تکمیل پاتا ہے۔ انسانی زندگی میں معاشرے کا قیام اس حیثیت ایک فرد کی سی ہے اور افراد کے مجموعے سے معاشرہ تکمیل پاتا ہے۔ انسانی زندگی میں معاشرے کا قیام اس کی فطرت کا تقاضا ہے یعنی انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور زندگی بسر کرنے پر فطرتاً مجبور ہے۔

اسلام نے فرد کی کردار سازی کے لئے اخلاق حسنہ کی ضمن میں بنی نوع انسان کو جو معاشرتی آداب و اطوار سکھائے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ افراد معاشرہ کے ایسی معاملات کا حسن برقرار رہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ عزت و تکریم پیش آئیں۔ وہ معاشرہ جو

قانون عدل و انصاف، برابری و مساوات پر مبنی ہوگا تو وہ معاشرہ یقیناً درست اور صالح ہوگا اور حقیقی معنوں میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام فرد کی اصلاح کے لئے اخلاق حسنہ پر زور دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں بیشتر مقامات پر اخلاق کا درس دیا گیا ہے جو اس قدر حکیمانہ اور فلسفیانہ ہے جو دنیا کے کسی مذہبی کتاب میں نہیں ملتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَصْعَقْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْسِ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ - وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْصُصْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ - (23) "اور لوگوں سے اپنا رخ نہ پھیر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چلن میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ۔ بے شک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔"

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ - (24) "اے ایمان والو! قومیں قوموں پر نہ نہیں (یعنی انسانوں اور قوموں کے اجتماع کی معاشرہ میں کوئی انسان دوسرے انسان کا، کوئی قوم دوسری قوم کا ہنسی مذاق نہ بنائے، امیر غریبوں کی ہنسی نہ بنائیں، نہ عالی نسب ذی نسب کی، نہ تندرست اپاہج کی، نہ آنکھ والا نابینا اور کم نظر کی، نہ زبان والا گونگے کی، نہ کان والا بہرے کا تمسخر اڑائے، یہ سب اخلاق سے گری حرک تیں ہیں جن کو اللہ کریم بہت ناپسند فرماتے ہیں) عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں، عورتوں پر ہنسیاں ہو سکتا ہے کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں اور آپس میں طعنہ زنی نہ کرو اور ای ک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔ کیا یہی برنامہ ہے مسلمان ہو کر فاسق کہلانا۔ اور جو اس سے توبہ نہ کریں وہی لوگ ظالم ہیں۔"

الحاصل انسان کی شخصیت کا نکھار اچھے اخلاق میں مضمر ہے۔ اچھے اخلاق کی بدولت انسان نہ صرف اس دنیا بلکہ مرنے کے بعد بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوگا۔ ابن مسکویہ نے اچھے اخلاق کو اپنانے کی نہ صرف تلقین کی ہے بلکہ نفس کی تہذیب و تربیت کے لئے کچھ ایسے نکات پیش کئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنے اخلاق سنوار سکے۔ یہ طریقے اور نکات درج ذیل ہیں: (25)

۱۔ تمام افعال و اعمال میں خیر کو شریعہ، عقائد میں حق کو باطل پر اور اقوال میں صدق کو کذب پر ہمیشہ فوقیت دینی چاہئے۔

۲۔ دائمی جہاد بالنفس کرتے رہنا یعنی انسان نفس کی خواہشات کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

ﷺ کے حکم کو مقدم و فائق رکھے۔

۳۔ التمسک بالشریعة، والذوم وظائفها یعنی شریعت پر عمل کرنا اور ان تمام اعمال کو لازم پکڑنا جو کہ شریعت کے وظائف میں

شامل ہیں یعنی جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو کرنا اور جن سے منع فرمایا ہے ان سے رک جانا۔

۳۔ تمام جرائم کی وعیدوں کو یاد رکھنا اور تمام گناہوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے نیز بندہ اور اللہ کے درمیان جو تعلق ہے وہ ہمیشہ ذہن نشین رہے۔

۵۔ لوگوں سے امیدیں نہ لگانا اور ان سے تکثیر اختلاط سے بچے۔ یعنی لوگوں کے ساتھ بے تکلف ہونے سے احتراز کرنا تاکہ ان پر اعتماد کرنے کی نوبت نہ آئے۔

۶۔ الصمت فی اوقات حرکات النفس للكلام، حتی يستشار فیہ العقل یعنی جب نفس کثرت کلام کی طرف مائل ہو تو نفس کو کثرت کلام سے روکنا اور عقل سے بھی مشورہ کرنا۔

۷۔ اپنے حال کی حفاظت کرنا نیز لوگوں سے اختلاط کی حالت و کیفیت میں فساد اور گناہوں میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

۸۔ الاقدام علی کل ماکان صوابا یعنی ہر نیک کام کی پیش قدمی کرنی چاہئے۔ یعنی اچھے اور پسندیدہ کاموں میں دلچسپی لینا اور ان کے لئے اقدام کرنا۔

۹۔ صرف ان چیزوں کا شوق ہونا چاہئے جو کہ آخرت کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں اور ان چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے جو کہ لایعنی اور فضول ہیں۔ یعنی ادنی مشاغل کے مقابلے میں اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی مشاغل میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا۔

۱۰۔ موت کا ڈر دل سے نکال دینا اور فقر کے خوف کو بھی دل میں جگہ نہ دینا اور جتنا کام انسان کر سکے اتنا کرتا رہے اور کثرت کلام چھوڑ دینا۔

۱۱۔ غناء اور فقر دونوں صورتوں میں اللہ پر بھروسہ رکھنا۔ نیک بختی اور بد بختی، شائستگی اور حقارت دونوں قسم کے سلوک کا اپنے آپ کو خو گر بنانا۔

۱۲۔ مرض کو صحت کے وقت یاد کرنا اور غم کو خوشی کے اوقات میں، رضا کو غضب کے وقت یاد کرنا چاہئے تاکہ طغی اور بغاوت کم ہو۔

۱۳۔ اللہ رب العزت کی رضا پر راضی رہنا چاہئے اور اس سے امید رکھنی چاہئے۔ یعنی صحت کی حالت میں بیماری کے ایام، غصے میں خوشی و مسرت کے لمحات کو یاد کرنا تاکہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے کی نوبت نہ آئے۔

۱۴۔ اللہ رب العزت پر توکل اور تمام معاملات اس ذات کی طرف لوٹنا۔ یعنی خدا پر بھروسہ رکھنا اور امید کا دامن کبھی ہاتھ

سے نہ چھوڑنا۔

اگر امام ابن مسکویہ کے ان تربیتی نکات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات بہت واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے اس میں دین کی تعلیمات کو سمونے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ علی طور پر انسان کو اخلاقیات کے حوالے سے جن چیزوں کو سنوارنے کی ضرورت ہوتی ہے امام ابن مسکویہ نے انہیں ان مختصر نکات میں احسن انداز میں بیان کر دیا۔ انہیں نکات پر اگر معاشرے کا ہر فرد کار بند ہو جائے تو اخلاقی اقدار کا احیاء اپنی تعبیر کو پہنچ جائے۔ اسلامی اقدار کا احیاء نہ صرف عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے بلکہ اسلامی معاشرے کی صحیح اسلامی تعبیر کے لئے بھی بنیادی اینٹ ہے۔

حوالہ جات

- (1) مباحث دستور ساز اسمبلی، جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 20، ص 1293
- (2) محمد خالد مسعود، مجلہ فکر و نظر، مقالہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اغراض و مقاصد: تاریخی و تحلیلی جائزہ، 1976ء، جلد 13، شمارہ نمبر 11، ص 77
- (3) ایضاً، ص 78
- (4) محمد میاں صدیقی، مجلہ فکر و نظر، مقالہ ادارہ تحقیقات اسلامی: تعارف، مقاصد اور دائرہ کار، 1983ء، جلد 20، شمارہ نمبر 9، ص 168
- (5) ایضاً، ص 169
- (6) مولانا محمد عبدالغفور زپوری، مفردات القرآن اردو، اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور، سن، ص 341، 342
- (7) طلال بن علی متی احمد، مادۃ اصول التریبۃ الاسلامیہ، مکہ مکرمہ، جامعہ ام القری، الکلیۃ الجامیہ، 1431ھ، ص 8
- (8) مولانا محمد عبدالغفور زپوری، مفردات القرآن اردو، اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور، سن، ص 397
- (9) القرآن الکریم، سورۃ الاعلیٰ، آیت نمبر 14
- (10) القرآن الکریم، سورۃ الشمس، آیت نمبر 9، 10
- (11) القرآن الکریم، سورۃ الجمعہ، آیت نمبر 2
- (12) القرآن الکریم، آل عمران، آیت نمبر 164
- (13) امام ابن تیمیہ، رسالہ فی الامر والارادہ، مشمول مجموعۃ الرسائل الکبریٰ، قاہرہ، 1323ھ، جلد 1، ص 334، 335
- (14) ڈاکٹر فضل الرحمن، قرون اولیٰ کے تشکیل دور کے بعد کا اسلام: اخلاقی اصول، مجلہ فکر و نظر، 1964ء، جلد 1، شمارہ نمبر 10، ص 14، 15
- (15) حبیب اللہ ندوی، علوم جدید اور اخلاق و مذہب، مجلہ فکر و نظر، 1965ء، جلد 2، شمارہ نمبر 7، ص 462، 463
- (16) ڈاکٹر فضل الرحمن، ہماری اخلاقی پستی کے اسباب اور اس کا علاج، مجلہ فکر و نظر، 1965ء، جلد 3، شمارہ نمبر 2، ص 132، 133
- (17) ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، قرآن و سنت میں اخلاق، مجلہ فکر و نظر، 1966ء، جلد 4، شمارہ نمبر 3، ص 141، 149
- (18) ڈاکٹر عبدالرحمن شاہ ولی، اخلاق اور اسلامی معاشرہ، مجلہ فکر و نظر، 1972ء، جلد 9، شمارہ نمبر 8، ص 579، 594
- (19) بشیر احمد صدیقی، نظام اخلاق قرآن کی روشنی میں، مجلہ فکر و نظر، 1977ء، جلد 15، شمارہ نمبر 1، ص 30، 36

- (20) پیر محمد کرم شاہ، نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم اخلاق، مجلہ فکر و نظر، 1980ء، جلد 17، شمارہ نمبر 8، ص 4، 16
- (21) محمد عبداللہ سلیم، اسلام کی اخلاقی تعلیمات، مجلہ فکر و نظر، 1982ء، جلد 20، شمارہ نمبر 2، ص 56، 66
- (22) ضیاء الحق، نبی اکرم ﷺ کا اخلاق حسنہ، مجلہ فکر و نظر، 1984ء، جلد 21، شمارہ نمبر 7، ص 24، 36
- (23) القرآن الکریم، سورہ لقمان، آیت نمبر 18
- (24) القرآن الکریم، سورہ حجرات، آیت نمبر 11
- (25) میر ولی الدین، تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ٹرانسلیشن بیورو، جامعہ عثمانیہ، انڈیا، 1943ء، ص 304

THE EDUCATIONAL AND TRAINING POLICY OF HOLY PROPHET (P.B.U.H.)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی و تربیتی پالیسی

سرمد احمد اسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی و فاتی اردو یونیورسٹی کراچی

خلیل احمد اسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی و فاتی اردو یونیورسٹی کراچی

ABSTRACT: God has made the personality of the holy prophet as an example for us where he has bestowed prophet hood on the holy prophet there the start of first revelation with "Read" indicates the importance and necessity of the knowledge. In order to give supremacy upon Angels, God made Adam to the learnt the names of things. In short, from Adam to the holy prophet means God has granted supremacy to knowledge right from the first prophet to the last prophet. It is certain that that the God sent the last holy prophet illiterate so that people can evaluate that the treasure of knowledge is directly entrusted to him by God. What was the method of learning & training for this education, it is evaluated by going through the life of the holy prophet that the method of learning was simple, easy and understandable? There was no constraints of age and position, that was the reason that the followers of the holy prophet could be enriched with knowledge in their elder ages. The institutes were formally established to give significance to knowledge. The persuasion of good sports and anger on study of bad material, all these are guideline for a teacher in addition to education. The broadness of teaching was so much that the students were taught Suryani Language in order to write letters to non-Muslims and answer them. It is the beautiful aspect of the life of the prophet that the teaching and training were not counted separately. The prophet was not only a perfect teacher but also a perfect patron. The method of teaching and training was so kind the no one was hesitated to acquire knowledge. The holy prophet responded very kindly to hard questions asked innocently. When and on what wrong words the holy prophet showed his anger, how much physical torture was there in his mode of teaching the guidance is available for us in all these matters through the events of life of the Holy Prophet (S.A.W)

KEYWORDS: personality, institutes, established, teaching, letters, Holy Prophet (S.A.W)

کلیدی الفاظ: علمی ارتقاء، رسول معلم، تعلیمات، تربیتی پالیسی، وحی، اسلام کی فضا

خلاصہ:

اللہ نے نبی کریم ﷺ کی ذات کو ہمارے لیے اسوہ بنایا ہے۔ جہاں نبی علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی، وہاں پہلی وحی ”اقرا“ سے شروع کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم سب سے اہم اور سب ضروری ہے۔ ابا آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فوقیت دینے کے لیے ان کو اشیاء کے اسماء کا علم دیا۔ غرض ابا آدم سے لے کر سرور دو عالم تک، یعنی پہلے نبی سے لے کر آخری نبی تک علم ہی کو فوقیت عطا فرمائی۔

علم کا مقصد، اپنے رب کی معرفت:

انسان کو حیوانات سے ممتاز کر دینے والی اشیاء میں سرفہرست اس کا علمی ارتقاء ہے۔ رسول معلم ﷺ کی سب سے پہلی وحی اسی بارے میں نازل ہوئی اس کے امتیاز کی سب سے وزنی دلیل ہے۔ جبریل علیہ السلام جب آپ ﷺ کے پاس پہلی وحی لے کر آئے تو سب سے پہلے ”اقرا“ یعنی پڑھنے کا حکم دیا، آیت مبارکہ پر اگر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سب سے اہم کام اور اس کا مقصد دونوں ساتھ ہی ذکر کر دیے گئے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ^۱۔ پڑھنا ہے، اور اس رب کے نام کے ساتھ پڑھنا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، گویا پڑھنے پڑھانے کا اصل مقصد اللہ رب العزت کو پہچانا ہے، جس کو انتہائی تعلیمات کے باوجود معرفت اور خشیت حاصل نہ ہوئی گویا مقصد سے محروم ہو گیا اور اگر کوئی کسی انجان یا بے نام جگہ رہ کر بھی تعلیم کے ذریعے رب تک پہنچ گیا، گویا اس نے مقصد کو حاصل کر لیا۔

زندگی بھر طالب علم:

اللہ کے نبی ﷺ کو پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ بہت محبوب تھا، اپنی زندگی کے مقاصد میں سے اس کو خاص طور پر ذکر فرمایا کہ ”میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں“، سنا ہم ساتھ ساتھ اپنے اصحاب کی ایسی تربیت فرمائی کہ ان کی زندگیاں بھی اسی مشغلے میں صرف ہوتی نظر آتی ہیں، اصحاب رسول ﷺ کے آثار میں جا بجا آپ کو ایسے اقوال اور ان کے حالات میں ان گنت مواقع پر آپ کو ایسا طرز عمل ملے گا کہ ان کی زندگیاں ان کاموں کے لیے وقف تھیں، چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ”عالم بنو، یا متعلم بنو، یا ان سے محبت کرنے والے بنو، یا ان کی اتباع کرنے والے بنو، پانچویں مت بننا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، اس روایت کے راوی حضرت حسن سے کسی نے پوچھا کہ پانچویں لوگوں سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: مبتدع“ (بدعتی)۔

یہ روایت ایک طریق سے اللہ کے نبی ﷺ سے بھی ثابت ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول منقول ہے۔³

آزاد طریقہ تدریس اور استاد کی جامع شخصیت:

اللہ کے نبی ﷺ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے، اور صحابہ کرام کو تعلیم دیتے۔ کوئی طالب قرآن سے متعلق سوال کرتا اور کوئی فرائض اور خواب کے متعلق دریافت کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فن میں ماہر ہونا اگرچہ کمال ہے، لیکن شخصیت کا جامع ہونا اور کم از کم دو تین علوم پر دسترس ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ طالب ایک ہی استاد سے بہت کچھ سیکھ سکے۔ اگر آپ کے پاس علم ہے اور آپ اسے لوگوں میں پھیلانا چاہتے ہیں تو آزاد طریقہ تعلیم سب سے آزمودہ ہتھیار ہے، آج ایسے لوگ بھی ہیں، جو لوگوں کی ضروریات اور پریشانیوں کو سمجھتے ہوئے مختلف اوقات میں کورسز کا انعقاد کرواتے ہیں، تاکہ کسی درجے میں آگاہی پھیل سکے۔ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ تعلیم میں مادی اشیاء جیسے عمارت، آفس، دفتر کے بجائے افراد سازی پر سب سے زیادہ توجہ تھی، لہذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم تعلیم کے ساتھ سہولیات کا ہر ممکن خیال تو رکھیں، لیکن اگر کبھی سہولیات میسر نہ ہوں تو تعلیم کو ہر گز پس پشت نہ ڈالا جائے۔ ہمارے طلبہ میں سہولیات کے حصول کا شوق انہیں بسا اوقات اچھی تعلیم سے محروم کر دیتا ہے، اس رویے کی بچ گنی ضروری ہے۔

تعلیم ہر عمر میں:

تیسری ایک اہم چیز جو اس ادارے میں تھی، وہ یہ کہ حلقہ محمدی میں شامل ہونے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ ہر عمر اور مزاج کے اصحاب کے لیے علم الہی کو سیکھنا ضروری تھا اور سب ہی سیکھتے تھے۔ آج ہمارے دور میں پرائیوٹ داخلوں کے ذریعے شرح ناخواندگی میں بہت حد تک کمی آتی جا رہی ہے۔ ہمیں اب سمجھ جانا چاہیے کہ تعلیم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، یہ سبق ہمیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے بھی ملتا ہے اور اصحاب محمد ﷺ کے عمل سے بھی۔

تعلیم کے لیے ادارے کا لازمی قیام:

اسلام کے ابتدائی دنوں میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعلیم کی لازمی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی، ایک مکان مختص کیا گیا تاکہ وہاں لوگوں کو دین سکھایا جاسکے، چنانچہ دارالرقم کو یہ سعادت حاصل ہوئی، بیت اللہ کے پڑوس

اور صفا پہاڑ کے دامن میں یہ ایک محفوظ مقام تھا، جو حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، یہاں جمع ہونے کی ترتیب اندھیروں میں ہوتی تھی کہ اس وقت حالات سازگار نہ تھے۔ پتہ چلا کہ تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر اس کو چھوڑا نہیں جاسکتا، بلکہ اس کی جب اور جو صورت ممکن ہو، دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

تعلیم عملی (پریکٹیکل) ہو:

اس ادارے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں نہ کتاب تھی، نہ قلم دوات، نہ تختہ سیاہ و سفید۔ یہاں تعلیم سینہ بسینہ کا رواج تھا۔ یہاں نو مسلم صحابہ کرام آتے تھے، اس وقت تک کی نازل شدہ وحی الہی کو حفظ کرتے تھے۔ اس وقت تک جاری شدہ احکامات جیسے نماز وغیرہ سیکھتے تھے۔ گویا وہاں علم کو عملی طور پر پریکٹیکل کے ذریعے سکھایا جاتا تھا۔ اب ابتدائی دنوں میں تعلیم کس طرح کی ہونی چاہیے، اس کے دونوں پہلو ہمارے سامنے آگئے،

1: حفظ کے ذریعے۔

2: عملی مشق کے ذریعے۔ ماہرین تعلیم اور تدریس کے شعبے سے وابستہ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ان دو چیزوں کی تعلیم و تعلم میں کتنی اہمیت ہے۔

عملی تعلیم کی مثالیں سیرت نبوی ﷺ میں متعدد ہیں، مثلاً: نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں اللہ رب العزت نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو دن خصوصی طور پر اسی مقصد کے لیے بھیجا، پہلے دن ہر نماز کا شروع وقت اور دوسرے دن ہر نماز کا آخری وقت، حضرت جبریل کی امامت کے ذریعے آپ ﷺ کو بتایا گیا۔

اسی طرح مسجد نبوی میں منبر پر نبی کریم ﷺ کا نماز ادا کرنا اسی مقصد کے لیے تھا کہ آپ کی نماز کی کیفیت کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشاہدہ کے ذریعے سیکھیں۔

مختلف فنون کی تعلیم:

مدینے میں جب اسلام کی فضا سازگار ہوتی چلی گئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص کو معلم بنا کر مدینہ بھیجا۔ میزبانوں نے اسعد بن زرارہ نقیب الانصار کے گھر پر مدرسہ قائم کر دیا۔ یہ مدینے میں قائم

ہونے والا پہلا اور اسلام کا دوسرا مدرسہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن سعید کاتب تھے، خوش خط تھے، وہ لوگوں کو تحریر اور کتابت بھی سکھاتے تھے۔⁴

اللہ کے نبی ﷺ سے گھر سواری، تیر اندازی اور تیراکی سیکھنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔⁵ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ اپنے اصحاب کو مختلف فنون میں مہارت دلانا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ”المؤمن القوي خير وأحب إلى الله من المؤمن الضعيف“⁶ یعنی رسول اللہ ﷺ کو پسند تھا کہ ان کے ساتھی مختلف فنون میں مہارت کے علاوہ جسمانی طور پر بھی مضبوط ہوں۔

ان درج ذیل واقعات سے ہم پر کچھ اہم چیزیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ رجال کار کی تیاری۔ اللہ کے نبی ﷺ نے پہلے تعلیمی ادارے سے تیار ہونے والے افراد کو مزید آگے بڑھانے کے لیے بھیجا تا کہ تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ چل پڑے اور مزید افراد اس سے بہرہ ور ہو سکیں۔ آج یہ چیز ختم تو نہیں تاہم کم ہو چکی ہے۔

۲۔ ہر اس چیز کا علم جس سے انسان کو چاہے دنیاوی فائدہ ہی کیوں نہ ہو، سیکھنے میں بخل یا اسے دینداری کے خلاف سمجھنا درست نہیں۔

۳۔ مختلف فنون میں تربیت حاصل کرنا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی صحت کا بھی خاطر خواہ لحاظ رکھنا، جسمانی ورزش کا اہتمام رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

یہاں ایک لطیف بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اسعد بن زرارہ کے گھر پر جو تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ وہی ان حضرات کی مسجد بھی تھی۔ نیز جب اللہ کے نبی ﷺ بنفس نفیس خود مدینہ تشریف لے آئے تو بھی مسجد نبوی کی تعمیر ضروری سمجھی، اور اسلام کے باقاعدہ مدرسے یعنی ”صفہ“ کا قیام عمل میں آیا۔ صرف یہی نہیں، تمام امور (جیسے قضاء و افتاء، تدریس، تذکیر، بیت المال، مستحقین کو تقسیم مال، مہمان خانہ، الغرض ہر قسم کے حکومتی، معاشرتی اور ثقافتی کام) مسجد میں انجام دیے جاتے تھے، اس بات پر صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی وجہ سے آج یہ تمام امور مسجد سے دور ہو چکے۔ تاہم ہمیں اس پر افسوس سے زیادہ اپنے اداروں کی بہتری کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تعلیمی بائبل کا قیام دور نبوی ﷺ میں:

مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ بائیں جانب ایک چبوترہ (صفہ) تعمیر کیا گیا۔ البتہ یہاں تعلیم اندھیروں کے بجائے روشنی میں دی جاتی تھی۔ اس مدرسے کی خصوصیات میں سے اس کا اقامتی ہونا تھا۔ یہاں مسافر طلبہ کے لیے دارالاقامہ یعنی ہاسٹل کی سہولت بھی موجود تھی۔ اس تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل حضرات کو قاری کہا جاتا تھا، وہ صاحب علم ہوتے تھے، ان کو تعلیمی ذمہ داریاں سپرد کی جاتی تھیں۔ وہ اپنے قبیلے میں جا کر لوگوں کو تعلیم دینے کا فرائض انجام دیتے تھے۔⁷

تعصب سے پاک تعلیم:

رسول اللہ کی زندگی میں تعلیمی حوالے سے ہمیں سب سے اہم بات یہ پتہ چلتی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے تعلیم کے حوالے سے کبھی متعصبانہ رویہ اختیار نہیں کیا، خود حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ یہودی خط ”سریانی“ سیکھ لو۔⁸ لہذا تعلیمی مواقع میں دوسری زبانوں کا سیکھنا، دیگر فنون کی مہارت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کو برا یا غلط جاننا نادانی ہی ہو سکتی ہے۔ تعلیمی حوالے سے تعصبانہ رویے کی مذمت ضرور کی جانی چاہیے۔

تاہم یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ ہر قسم کی چیزیں پڑھنے کے قابل نہیں ہوتیں، ان کو روکنے کے لیے بھی جامع پالیسی کی ضرورت ہے۔ اسوہ نبوی ﷺ کی روشنی میں ہر ایسا علم و ہنر اور فن و کسب، شریعت جس کو بے فائدہ سمجھتی ہے، اس کے حصول کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ مثلاً شطرنج، مزد شیر وغیرہ ذلک۔

درست مضامین کا انتخاب:

حصول علم کے لیے سب سے پہلے درست اور مناسب موضوع کا انتخاب لابدی ہے۔ جس میں سب سے بنیادی چیز وہ موضوع ہے جو متعلم کی دلچسپی کے میدان سے ہو، اسی طرح اس دور میں سوسائٹی اور معاشرہ میں اس کی ضرورت بھی ہو۔

رحمتِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”بعض علم جہالت ہیں، ان کو نہ پڑھو“⁹ پتہ چلا کہ انسان کو بحیثیت استاد اپنے طالب علم کی اچھے اور برے کی رہنمائی کرنا اشد ضروری ہے، غلط معلومات سے روکنا بھی استاد کی ذمہ داری بنتی ہے۔ اس کے لیے استاد کو اچھی تدابیر کے ذریعے طلبہ کو درست معلومات بہم پہنچانی چاہئیں۔

آج کے دور میں جب کہ علم کے نام پر لوگوں میں افواہوں اور من گھڑت چیزیں پھیلانے کا رواج جڑ پکڑ چکا ہے، ضرورت ہے کہ اپنے طلبہ میں تحقیق کا ذوق پیدا کیا جائے۔ تاکہ وہ آگے چل کر بے بنیاد چیزوں کے بجائے تحقیق کے راستے کو اپناتے ہوئے ملک و

ملت کا نام روشن کر سکیں۔ اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی لازم ہے کہ ہم ہر چیز میں اپنے نبی ﷺ سے رہنمائی لیں کہ حیات فانی کا کوئی گوشہ انہوں نے تشنہ نہیں چھوڑا، ہر اہم چیز کے بارے میں ان کے ارشادات موجود ہیں۔

معلم و مربی اسوہ رسول ﷺ کے مطابق:

تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس حوالے سے رہنمائی فراہم کرنے والے نبی کی ایک ایک ادا محدثین و فقہاء کی مہربانی سے آج ہم تک صحیح طور پر محفوظ بھی ہے۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ سنت و سیرت ہماری اس حوالے سے کیا رہنمائی کر رہی ہے۔

نبی معلم ﷺ کے ساتھی جن کو اصحاب محمد ﷺ کہا اور پڑھا جاتا ہے، نبی کریم ﷺ سے مختلف حیثیت سے تعلق رکھتے تھے، وہ یک وقت عاشق بھی تھے، عامل بھی تھے، عارف بھی تھے۔ نبی ﷺ کی موجودگی میں دین کی باتیں سیکھنے کا مرکز واحد آپ ﷺ کی ذات تھی، لہذا یہ حضرات رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے شاگرد بھی تھے۔ لہذا ان کی سیرت سے ہمیں تعلیمی حوالے کے ساتھ ساتھ تربیت کے میدان میں بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

تربیت تعلیم کا لازمی جزو:

تربیت تعلیم کا جزو لاینفک ہے، جسے تعلیم سے ہر گز جدا نہیں کیا جاسکتا، تعلیم کا بنیادی مقصد شعور بتلایا جاتا ہے، اور یہ شعور استاد کی تربیت کے بغیر اجاگر ہونا بہت مشکل ہے، صحابہ رضوان اللہ علیہم کو شاگرد کے روپ میں دیکھیں اور رسول اللہ ﷺ کے انداز تربیت پر غور کریں تو یہ موضوع بہت طویل ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہو جاتا ہے۔ ایک استاد کو اپنے شاگردوں کی کس طرح تربیت کرنی چاہیے، ان کے سوالوں پر، شاگردوں کے منفی برتاؤ پر، غصہ دلانے پر، کس طرح کار د عمل پیش کرنا چاہیے۔ شاگردوں کی عزت نفس کا کتنا خیال رکھنا چاہیے، ان کو کب اور کس طرح تنبیہ کرنی چاہیے، سزا کا کتنا اور کیا معیار ہونا چاہیے۔ یہ سب سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں آج ہمارے سامنے ہے۔

غصہ دلانے والے سوال پر خوش اسلوبی سے جواب:

مثلاً ایک مرتبہ ایک شاگرد نے حاضر ہو کر زنا کی اجازت مانگی، یہ ایک ایسا موقع تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی خود پر رکھ کر سوچ سکتا ہے کہ کس قدر غصہ دلانے والا موقع تھا، لیکن استاد و مربی رسول اللہ ﷺ کی ذات مقابل تھی، لہذا ایسے اسلوب سے سمجھایا کہ آئندہ آنے والے اساتذہ بھی اس سے سبق سیکھ سکیں، قریب بلوایا اور پیار سے مثال دے کر سمجھایا کہ اگر کوئی یہ کام تمہارے گھر والوں

کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم قبول کر لو گے؟ نیز اسی طرح دو تین مثالیں دے کر اس کو نرمی سے سمجھا کر قائل کر لیا، راوی کہتے ہیں اس محبت بھری ترغیب کے بعد مذکورہ شاگرد کا دھیان بھی کبھی اس گناہ طرف نہیں گیا۔¹⁰

غم کے موقع پر طلبہ کی دادرسی:

ایک مرتبہ ایک کم عمر صحابی رضی اللہ عنہ (جن کی کنیت ابو عمیر تھی) اپنے پرندے کی موت پر غمزدہ بیٹھے تھے، اللہ کے نبی ﷺ ان کے پاس آئے اور دل لگی کے انداز میں فرمایا ”یا ابا عمیر مافعل النغیر“ ترجمہ: اے ابو عمیر! بغیر کو کیا ہوا؟¹¹ ”نغیر“ یہ چڑیا کے مثل چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے، جس کی چونچ لال ہوتی ہے۔¹² اس جملے میں دل لگی اور ہمدردی کا اندازہ اسی شخص کو ہو سکتا ہے، جو کسی شخصیت سے بہت متاثر ہونے کے علاوہ اس سے بے پناہ محبت بھی رکھتا ہو، ایسی کسی ہستی کا اس قدر پوچھ لینا بھی بہت ہوتا ہے۔

تربیت کے لیے حسب موقع غصہ بھی ضروری:

امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ جس کو غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے¹³۔ لہذا استاد کو کسی موقع پر غصہ بھی آ سکتا ہے، لیکن اس غصے میں انداز کیا ہو اور غصہ کس حد تک ہو، آئیے دور نبوی ﷺ کی ایک جھلک دیکھتے ہیں:

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ تقدیر کے مسئلے پر مباحثہ کر رہے ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا فرمایا: کیا اسی بات کا تم لوگوں کو حکم کیا گیا ہے؟ کیا اسی چیز کے لیے تم لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے؟¹⁴

راوی اس روایت میں ایک بات یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کا چہرہ انار کی مانند سرخ ہو گیا، اصحاب عقل جانتے ہیں کہ ایسا صرف غصے کی شدت میں نہیں، بلکہ شدید غصے کو برداشت کرنے کی صورت میں ہوتا ہے، لہذا سیکھنے کی پہلی چیز تو یہ ہے کہ آخری حد تک غصہ برداشت کرنے کے علاوہ شاگردوں کو واپس درست موضوع کی طرف موڑنا بھی استاد کی رہنمائی میں داخل ہے، لہذا ان کو ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ”کیا اسی چیز کا تم لوگوں کو حکم کیا گیا تھا؟“ گویا مقصود اصلی کی طرف رہنمائی فرمادی کہ جس کام کا تم لوگوں کو حکم کیا گیا ہے اسی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھو۔

سزاکامعیار:

اللہ کے نبی ﷺ نے کبھی اپنے شاگردوں کو سزا نہیں دی، اس کا اگرچہ یہ مطلب نہیں کہ سزا دینا درست نہیں، تاہم جس انداز سے تربیت اللہ کے نبی ﷺ نے کی، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم بھی اسی منہج پر اپنے طلبہ کی تربیت کریں اور اگر کہیں مار کو ناگزیر خیال کریں تو پھر رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ حدود سے ہر گز تجاوز نہ کریں۔ چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے بچوں کو نماز سے متعلق تاکید

کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو، جب وہ دس سال کے ہو جائیں“¹⁵

اس روایت میں اگرچہ مار کا ذکر ملتا تو ہے، لیکن فقہاء کرام نے اس کی حدود مقرر کی ہیں¹⁶ کہ

۱۔ لکڑی وغیرہ کے بجائے ہاتھ سے مارا جائے۔

۲۔ ہلکے ہاتھ سے مار لگائی جائے۔

۳۔ تین دفعہ سے زیادہ نہ مارا جائے۔

۴۔ چہرے اور جسم کے نازک اعضاء پر نہ مارا جائے۔

آخری بات:

اپنی بات کا اختتام ایک دانائی کی بات پر کروں گا کہ

”اچھی اچھی ساری باتیں کہی، لکھی اور پڑھی جا چکیں، بس ان پر عمل باقی ہے۔“

اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حوالہ جات

1 سورة العلق: 1.

2 ابن ماجہ، أبو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، فی الایمان وفضائل الصحابۃ والعلم، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، دار الفکر، بیروت، رقم الحدیث: 229۔

3 أبو بکر المہدی، أحمد بن الحسن بن علی بن موسیٰ الخسروی جردی الخراسانی، (التوفی: 458ھ)، المدخل الی السنن الکبری، رقم الحدیث: 288۔

4 ایضاً، رقم الحدیث: 288۔

- 5 نسائی، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، سنن النسائي، ابواب الملاعبة، باب ملاعبة الرجل زوجته، رقم الحديث: 8882-
- 6 نيسابوري، مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري، صحيح مسلم، باب معرفة الركعتين الخ، رقم الحديث: 2664-
- 7 محمد سليم، اسلام کا نظام تعلیم، زوار اکیڈمی پبلیکیشنز، ناظم آباد، کراچی، اشاعت پنجم اکتوبر 2017ء، ص: 27
- 8 ترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سؤرة بن موسیٰ بن الضحاک،، أبو عیسیٰ (المتوفی: 279ھ-) سنن الترمذی، ابواب الاستئذان والآداب، باب ماجاء فی تعلیم السریانیہ، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبي، رقم الحديث: 2715-
- 9 سجستانی، أبوداود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي، سنن أبي داود، كتاب الادب، باب ماجاء فی الشعر، دار الكتاب العربي، بيروت، رقم الحديث: 5041-
- 10 ابن ماجه، احمد بن حنبل، مسند الإمام أحمد بن حنبل، مؤسسة الرسالہ، رقم الحديث: 22211-
- 11 سنن أبي داود، كتاب الادب، باب ماجاء فی الرجل یکنی لہ ولد، دار الكتاب العربي، بيروت، رقم الحديث: 4971
- 12 ابو غده، عبدالفتاح، الرسول المعلم واسالیبہ فی التعلیم، رقم الصفیہ: 163-
- 13 بیہقی، أحمد بن الحسن بن علي بن موسی الخسرو جردی الخراساني، أبو بكر البیهقي (المتوفی: 458ھ-)، شعب الایمان، باب العشرون من شعب الایمان، وهو باب فی الطسارات، فضل الموضوع، دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعة الأولى: 1410، تحت رقم الحديث: 8734-
- 14 ابن ماجه، سنن ابن ماجه، فی الایمان وفضائل الصحابة والعلم، باب فی القدر، دار الفکر، بیروت، رقم الحديث: 85-
- 15 سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب متى یؤمر الغلام بالصلاة، دار الكتاب العربي، بيروت، رقم الحديث: 495-
- 16 ابن عابدین شامی، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقی الحنفی (المتوفی: 1252ھ-)، رد المحتار علی الدر المختار، كتاب الحضرة والا باحیه، فصل فی البیج، دار المعرفه، ج: 9، ص: 710-

ORIENTALIST'S OBJECTIONS ON THE HOLY PROPHET'S FAMILY LIFE AND ITS JUSTIFICATION –AN INTELLECTUAL STUDY

رسول کریم ﷺ کی عائلی زندگی پر مستشرقین کے اعتراضات و جوابات کا علمی مطالعہ

رابعہ بنت ملک محمد امتیاز معاون استاد و ریسرچ اسکالر، جامعہ کراچی۔

ABSTRACT: The present Article is the analytical study of the objections of orientalist on the family life of prophet (P.B.U.H). And the research findings delineate that their objections are based on mendacity. Orientalist hikes the vital remonstrance on the marriages of Prophet (P.B.U.H). They have developed the different dimensions to hold objections on the said topic while there is a social, educational and political cause that Prophet had so, he did these marriages and causes to mend Social, Political and moral turmoil. Orientalist failed to expostulate this expediency because of having extremist ideology. And they had lack of knowledge.

KEYWORDS: Orientalist, family life, extremist ideology and Intellectual study.

مستشرقین کا تعارف:

مستشرقین مشتق ہے، استشرق سے جس کا مادہ شرق ہے۔ عربی اور اردو میں مستشرق اور استشرق کے الفاظ علی الترتیب انگریزی کے اورینٹلسٹ (Orientalist) اور اورینٹلزم کے ترجمے یا متبادل کے طور پر رائج ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اورینٹلزم (Orientalism) کا معنی ہے مشرقی خصوصیات ”مشرقی رسوم و رواج، مشرقی ثقافت و تہذیب، مشرقی زبانوں اور مشرقی اقوام سے متعلق علم و مہارت بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

استشرق کی جو تعریف عام طور پر مشہور ہے وہ یہ ہے: ”غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشرق ہے۔“ اس تعریف کی رو سے جو غیر مشرق عالم، مشرقی علوم کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے گا اسے مستشرق کہا جاتا ہے۔ شرف الدین اصلاحی اس ”Orientalist“ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ لفظ انگریزوں کا وضع کردہ ہے جس کے لئے عربی میں استشرق کا لفظ وضع کیا گیا ہے۔ لفظ ”Orient“ بمعنی مشرق اور ”Orientalism“ کا معنی شرق شناسی یا مشرقی علوم و فنون اور ادب میں مہارت حاصل کرنے کے ہیں۔ مستشرق (استشرق کے فعل سے اسم فاعل) سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بہ تکلف مشرقی بنتا ہے۔ (۲)

ان تمام تعریفات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستشرق اسے کہتے ہیں جو مشرقی علوم میں مہارت رکھتا ہو۔ ایک غیر مشرق کا مشرقی علوم کے بارے میں دسترس حاصل کرنا ان کے علوم و فنون میں مکمل ماہر ہونا مستشرق کہلاتا ہے۔

رسول کریم ﷺ کی عائلی زندگی پر مستشرقین کے اعتراضات و جوابات

حضور ﷺ کی عائلی زندگی پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا ہے وہ تعدد ازدواج کا ہے۔ مستشرقین نے اس حوالے سے کئی اعتراضات

کیئے اور حضور ﷺ کی سیرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی جب کہ حضور ﷺ کی ذمہ داری چونکہ اپنی اُمت کے ہر فرد کی ذمہ داری سے کہیں زیادہ کٹھن تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین ایسے نازل فرمائے جو آپ کے لئے خاص تھے اور اُمت ان قوانین سے مستثنیٰ تھی۔

تعداد ازواج پر قرآنی آیات: اس حوالے سے قرآنی آیات مندرجہ ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَ بَنَاتِ عَمَّتِكَ وَ بَنَاتِ خَالِكَ وَ بَنَاتِ خَلَّتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَ امْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِن وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔

اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لئے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں اور آپ کی کنیزیں جو اللہ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی خالائوں کی بیٹیاں، جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ اور مومن عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کر دے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لئے ہے دوسرے مومنوں کے لئے نہیں۔ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے۔ مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ (۳)

بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کے معاملے میں بھی اللہ نے آپ ﷺ کو امتیازی شان عطا فرمائی جہاں ایک اُمتی کو تمام بیویوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا وہاں حضور ﷺ کے لئے فرمایا: تُرْجَى مَنْ تَشَاءُ مِنْهُمْ وَ تُثَوِّى إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ وَ مَنْ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَلِكَ أَدْبَىٰ أَنْ تَقْرَءَ أَعْيُنُهُمْ وَ لَا يَحْزَنَ وَ يَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۗ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا۔

” (آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے اور اپنے پاس رکھیں جس کو چاہیں اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس رخصت سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزرہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے۔“ (۴)

عام اُمتی کو چار بیویوں کی حد کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنے یا کسی اور عورت سے شادی کرنے پر کوئی قانونی پابندی نہیں لیکن حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ایک مرحلہ آیا جب آپ کو مزید نکاح کرنے یا کسی زوجہ کو دوسری زوجہ سے بدلنے کی ممانعت کر دی گئی۔

ارشادِ خداوندی ہے: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَا تَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا.

”حلال نہیں آپ کے لئے دوسری عورتیں اس کے بعد اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کر لیں ان ازواج سے دوسری بیویاں اگرچہ آپ کو پسند آئے ان کا حسن بجز کنیزوں کے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔“ (۵)

ولیم میور کا اعتراض اور اس کا جواب:

تعداد ازدواج کے حوالے سے ولیم میور (۱۸۸۹ء-۱۸۰۷ء) محمد اینڈ اسلام میں لکھتا ہے کہ:

Mohammad was now going on to three three score years; but weakness for the sex seemed only to grow with age, and the attractions of his increasing harem were insufficient to prevent his passion from wandering beyond its ample limits. ۶

”آپ محمد (ﷺ) کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن جنس مخالف کی طرف میلان کی کمزوری میں عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ آپ کے بڑھتے ہوئے حرم کی کشش آپ کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے روکنے کے لئے کافی نہ تھی۔“ ۷

تعداد ازدواج کے حوالے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طرزِ عمل سابقہ انبیاء کے عین مطابق ہے کیونکہ آپ ﷺ سے قبل جتنے بھی انبیاء آئے ان میں سے بعض نے کئی شادیاں کی اس لئے آپ ﷺ کا یہ عمل منہاجِ نبوت کے عین مطابق ہے۔

یہود و نصاریٰ کی الہامی کتب ہمیں خود بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔

اسی طرح بائبل کے مختلف مقامات پر حضرت داؤد علیہ السلام کی نو بیویاں، دس حرموں اور ان کے علاوہ کچھ اور حرموں اور جوڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق بائبل ہمیں بتاتی ہے۔

”And he came to have seven hundred wives, princesses, and three hundred concubines.“ ۸

”اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں اور تین سولہ بیویاں تھیں۔“ ۹

بائبل کی ان تمام آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا تعداد ازدواج پر عمل عین نبوت کے مطابق ہے۔

حضرت زینب سے نکاح پر مستشرقین کا اعتراض و جواب:

ولیم میور یہ افسانہ اس طرح لکھتا ہے:

Mohamed was now going on to three- score years: but weakness for the sex seemed only to grow with age, and the attractions of his increasing harem were insufficient to prevent his passion from wandering beyond its ample limits.

Happening one day to visit the dwelling of his adopted son Zeid, he found him absent. As he knocked, Zeinab, wife of Zeid, started up in confusion to array herself

decently for the Prophet's reception. But the charms had already through the half – opened door, unveiled themselves too freely before his admiring gaze; and Mohomet, smitten by the sight, exclaimed, "Gracious lord! Good Heavens! How thou dost turn the hearts of men!" The words, uttered as he turned to go, were overheard by Zenab, and she, proud of her conquest, was nothing loth to tell her husband of it. Zeid went at once to Mahomet, and offered to divorce his wife for him, "Keep thy wife to thymself. "He answered, and fear God. "But the words fell from unwilling lips. ۱۰

”محمد (ﷺ) کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ جنس کے معاملہ میں ان کی کمزوری میں اضافہ ہو رہا تھا اور ان کے بڑھتے ہوئے حرم کی کشش ان کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے باز رکھنے کے لئے کافی نہ تھیں۔ ایک روز وہ اپنے منہ بولے بیٹے زید سے ملنے ان کے گھر گئے لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھے، انہوں نے دستک دی۔ زید کی بیوی زینب رسول خدا کا مہذبانہ استقبال کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگیں لیکن ان کا حسن، نیم وادروازے کے راتے، محمد (ﷺ) کی مشتاق نگاہوں کے سامنے اپنے آپ کو مکشف کر چکا تھا۔ اس منظر سے مغلوب ہو کر انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ”سبحان اللہ!“ اے اللہ! تو لوگوں کے دلوں کو کیسے پھیر دیتا ہے۔ ”وہ الفاظ جو محمد (ﷺ) نے واپس جاتے ہوئے اپنی زبان سے ادا کئے تھے وہ زینب نے سن لیے۔ وہ اپنی فتح پر نازاں تھیں اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے خاوند کے سامنے بیان کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی۔ زید یہ سن کر فوراً محمد (ﷺ) کے پاس گئے اور ان کی خاطر اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی پیشکش کی۔ انہوں نے کہا: خدا سے ڈرو اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو۔ یہ الفاظ بے دلی سے ان کی زبان پر آئے تھے۔“ ۱۱

ولیم میور اسی طرح افسانوی رنگ میں اس قصے کو آگے بڑھاتا ہے اور زید کی طرف سے حضرت زینب کو طلاق کے بعد، حضور ﷺ کے ساتھ ان کی شادی کو افسانوی انداز میں یوں بیان کرتا ہے:

”Even in Arabia, to marry the divorced wife of an adopted son was a thing unheard of, and he foresaw the scandal, it would create. But the flame would not be stifled. And so, casting his scruples to the winds, he resolved at last to have her.“ ۱۲

”اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی ایسی بات تھی جو عرب جیسے ملک میں بھی نئی تھی۔ محمد (ﷺ) نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نکاح سے ان کی بڑی بدنامی ہوگی لیکن محبت کا شعلہ بجھنے والا نہ تھا۔ انہوں نے ضمیر کی ہر خلش کو جھٹک دیا اور ہر قیمت پر زینب کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔“ ۱۳

حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی حکم خداوندی سے ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو ولیم میور اپنے مخصوص انداز

میں یہ معنی پہناتا ہے:

”The marriage caused no small obloquy, and to save his reputation Mahomet fell back upon his oracle. A passage was promulgated which purports on the part of the

Almighty not only to sanction the union, but even reprehend the prophet for hesitating to Consummate it, from the fear of men.” ۱۴

”اس نکاح سے محمد (ﷺ) کی کچھ کم بدنامی نہ ہوئی۔ اپنی شہرت کو محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے وحی کا سہارا لیا۔ ایک آیت تشہیر کی گئی جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ اس بات پر محمد (ﷺ) کو تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے لوگوں کے خوف سے اس شادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیوں کیا۔“ ۱۵

ولیم میور نے اس کے بعد اس پوری آیت کا ترجمہ لکھا ہے جس میں حضرت زینب کی حضور ﷺ کے ساتھ شادی کا ذکر ہے پھر اس نے ان قرآنی آیات کے متعلق یہ تبصرہ کیا ہے:

“Could the burlesque of inspiration be carried father? Yet this verse as well as the revelation chiding him because he did not marry Zeinab, and the other passages on the Prophet's relations with his household, are all incorporated in the Coram, and to his day are gravely recited in due course, as a part of the word of God, in every mosque throughout Islam.” ۱۶

ترجمہ: ”کیا وحی کے مزاح کو اس سے آگے لے جانا ممکن ہے؟ اس کے باوجود یہ آیت اور وہ وحی جس میں زینب سے شادی نہ کرنے پر محمد (ﷺ) کو تنبیہ کی گئی ہے، اور دیگر آیات جن میں محمد (ﷺ) کے اپنے اہل خانہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے، وہ سب قرآن کا حصہ ہیں اور آج تک دنیائے اسلام کی ہر مسجد میں کلام اللہ کے طور پر ان کی تلاوت ہوتی ہے۔“ ۱۷

ولیم میور یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ خانگی معاملات پر کسی الہامی کتاب میں گفتگو وحی کے ساتھ مذاق ہے جبکہ ولیم میور خود کٹر عیسائی ہے اور بائبل ان کے پاس موجود ہوگی اور وہ اس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہوں گے۔ بائبل میں بھی اللہ کے رسولوں کے حوالے سے ایسی بہت سی باتیں منسوب ہیں جو ان کے لئے کہنا درست نہیں تو کیا ولیم میور کو وہاں وحی کے ساتھ مذاق نظر نہیں آتا۔ اور قرآن مجید اگر انسانوں کی خانگی زندگی کو منظم کرنے کے لئے قانون اور ضابطے مقرر کرے تو ان کے نزدیک یہ وحی سے مذاق بن جاتا ہے۔

جس طرح ولیم میور نے حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے، ٹرانڈرائے نے بھی اس قصے کو وہی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، وہ اس قصے کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حسن اور غرور کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت زینب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بڑی باکپاز تھیں لیکن، اس کے خیال میں، اس پاکبازی کا تعلق ان کی عمر کے آخری حصے سے ہوگا۔

پیر کرم شاہ الازہری مستشرقین کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”مستشرقین غیر جانبدار محقق سمجھے جاتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ اور افسانے میں فرق ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضور ﷺ کی تاریخ کو افسانوی رنگ میں لکھنے کی سازش جان بوجھ کر کی ہے۔ اگر وہ حضور کی حیات طیبہ کے واقعات کو تاریخ نویسی

کے اصولوں کے مطابق پرکھیں تو انہیں آپ کی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں مل سکتی جس کے ذریعے وہ آپ کے کردار کو داغ دار کر کے لوگوں کو آپ کے دین سے متنفر کر سکیں۔ چونکہ حضور ﷺ کے متعلق کچھ لکھنے سے ان کا اصل مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ آپ کے کردار کو مشکوک کر کے دین اسلام کی بنیادیں کمزور کریں، اس لئے یہ اصل مقصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے اور کسی مقام پر بھی ان کی آنکھوں سے او جھل نہیں ہوتا لیکن مستشرقین اس معاملہ میں سخت غلط فہمی کا شکار ہیں وہ خواہ افسانہ لکھیں یا ڈرامہ، جس ہستی کو اللہ نے ہر خامی سے پاک رکھا ہے، اس کے دامن پر دشمنوں کی طرف سے لگایا جانے والا کوئی دھبہ ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ باطل میں اتنی طاقت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ حق کو مغلوب کر سکے۔ روشنی کی ایک کرن اندھیروں کا سینہ چیر دیتی ہے اور شب و بجور کی تاریکیاں ایک چراغ کی روشنی کو مدھم نہیں کر سکتیں۔“ ۱۸

مستشرقین نے اس افسانے کے ذریعے محمد عربی ﷺ کو جس رنگ میں دکھانے کی کوشش کی ہے آپ کا دامن اس سے پاک ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ہر عمل حکم ربی اور معاشرے کی اصلاح کے تحت تھا اس میں نفس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مستشرقین کا یہ کہنا کہ اچانک حضور ﷺ کی نظر حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر پڑی تو آپ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے، یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے لئے اجنبی نہ تھیں بلکہ بھوپھی کی بیٹی تھیں۔ آپ چاہتے تو خود ان سے نکاح کر سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زید سے خود کروایا جبکہ آپ ﷺ کے لئے خود نکاح کرنا یہ آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں کا انصاف ہے کہ حضور ﷺ کی نظر ان پر پڑی تو آپ ﷺ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

امام ابو بکر ابن عربی اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انه باطل لا يصح النظر اليه فانه كان معها في كل وقت و موضع ولم يكن هناك حجاب يمنعها منه فكيف تتشامع وينشا معها ينظرها في كل ساعة ولا تقع في قلبه الا اذا كان لها زوج وقد وهبت نفسها وكرهت غيره فلم يخطر ذالك بباله فكيف يتجدد الهوى بعد العدم حاشا لذالك القلب المطهر من هذه العلاقة الفاسدة.“ ۱۹

”یہ قصہ باطل ہے، اس کی طرف دیکھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ حضرت زینب ہر وقت اور ہر جگہ آپ کے ساتھ رہیں۔ ان کے درمیان حجاب نہ تھا کہ حضور ﷺ ان کو دیکھ نہ سکتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں نے ایک ساتھ پردہ پوش پائی ہو، حضور ﷺ ہمیشہ انہیں دیکھتے رہے ہوں لیکن ان کی محبت حضور ﷺ کے دل میں پیدا نہ ہوئی ہو اور جب ان کی شادی ہو چکی ہو اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہوں تو اچانک حضور ﷺ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جان حضور کو ہبہ کی تھی اور

کسی دوسرے کو پسند نہ کیا تھا لیکن ان تمام باتوں کی حضور ﷺ نے پروا نہیں کی تھی، تو وہ محبت جو اتنا عرصہ حضور ﷺ کے دل میں پیدا نہ ہوئی تھی وہ اچانک کیسے پیدا ہو گئی۔ یقیناً حضور ﷺ کا قلب اطہر اس قسم کی چیزوں سے قطعاً پاک ہے۔“ ۲۰

منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

“Despite the stories, then, it is unlikely that he was swept off his feet by the physical attractiveness of Zaynab. The other wives are said to have feared her beauty; but her age when she married Muhammad was thirty five, or perhaps rather thirty – eight, which is fairly advanced for an Arab woman.” ۲۱

”ہر قسم کی کہانیوں کے باوجود یہ بات ناممکن ہے کہ زینب کی جسمانی کشش کی وجہ سے محمد (ﷺ) کے قدم ڈگمگائے ہوں، کہا جاتا ہے کہ محمد (ﷺ) کی دوسری بیویاں زینب کے حسن سے خائف تھیں لیکن محمد (ﷺ) کے ساتھ شادی کے وقت ان کی عمر پینتیس بلکہ اڑتیس سال تھی۔ ایک عرب عورت کے لئے یہ عمر بڑی عمر شمار ہوتی ہے۔“ ۲۲

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر اس افسانے کے متعلق یہ تبصرہ کرتا ہے:

“It is most unlikely that at the age of fifty – six such a man as he should have been carried away by a passion for a woman of thirty – five or more.” ۲۳

”یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ محمد (ﷺ) جیسا ایک چھپن سالہ شخص ایک ایسی عورت کے متعلق جذبات کی رو

میں بہہ گیا ہو جس کی عمر پینتیس سال یا اس سے بھی زیادہ تھی۔“ ۲۴

منٹگمری واٹ حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

“The criticism of Muhammad, then, was based on a pre-Islamic idea that was rejected by Islam, and one aim of Muhammad in contracting the marriage was to break, the hold of the old idea over men’s conduct. How important was this aim compared with others which he might have had?” ۲۵

”زینب بنت جحش سے محمد (ﷺ) کی شادی کے وقت، ان پر جو تنقید ہوئی تھی اس کی وجہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو اسلام نے ختم کر دیا تھا۔ اس شادی سے محمد (ﷺ) کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے رویے پر اپنی رسم کا جو غلبہ تھا، اس کو ختم کیا جائے۔ اس شادی کا یہ مقصد اس کے دیگر مقاصد کے مقابلے میں کتنا اہم تھا؟“ ۲۶

ان تمام حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح دیگر شادیوں کا تعلق حضور ﷺ کی خواہشات کی تسکین نہ تھا بلکہ اس میں تعلیمی، سماجی اور سیاسی مقاصد تھے اسی طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح انہی مقاصد کے تحت تھا۔ منٹگمری واٹ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور اپنے مستشرق بھائیوں کے برخلاف لکھا ہے اور واضح کیا ہے کہ تعدد زوجات کے حوالے سے حضور ﷺ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

“The lost feature to be noted about Muhammad’s marriage is that he used both his own and those of the closest companions to further political ends. This was doubtless a continuation of older Arabian practice. All Muhammad’s own marriages can be seen to have a tendency to promote friendly relations in the political sphere. Khadijah brought him wealth and the beginning of influence in Meccan politics. In the case of sawdah, whom he married at Mecca, the chief aim may have been to provide for the widow of a faithful Muslim, as also in the later marriage with Zaynab bint Khuzaymah; but sawdah’s husband was the brother of a man whom Muhammad perhaps as wanted to keep from becoming an extreme opponent: and Zaynab’s husband belonged to the clan of al-Muttalib, for which Muhammad had a special responsibility, while he was also cultivating good relations with her own tribe of Amir bin Saraah. His first wives at Madina, Aishah and Hafsa, were the daughters of the men on whom he learned most, Abu Bakr and Umar and Umar also married Muhammad’s granddaughter, Umm-e-Kulthum bint Ali. Umm-e-Salamah was not merely a deserving widow, but a close relative of the leading man of the Meccan clan of Makhzum, Juwayriyah was the daughter of the chief of the tribe of al-Mustaliq, with whom Muhammad had been having special trouble. Zaynab bint Jahsh, besides being Muhammad’s cousin, was a confederate of the Meccan clan of Abd Shams, but a social motive may have outweighed the political one in her case to demonstrate that Muhammad had broken with old taboos. Nevertheless, the class of ‘Abd Shams’ and Abu Sufyan b. Harb in particular, were in his thoughts, for Abu Sufyan had a Muslim daughter, Umm-e-Habibah, married to a brother of Zaynab bint Jahsh; and when the husband died in Abyssinia, Muhammad sent a messenger there to arrange a marriage with her. The marriage with Maymunah would similarly help to cement relations with her brother-in-law, Muhammad’s Uncle, al-Abbas. There may also have been political motives in the unions with the Jewesses, Safiyah and Rayhanah.” ۲۷

”محمد (ﷺ) کی شادیوں کے بارے میں آخری بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی اور اپنے قریبی ساتھیوں کی شادیوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جو عربوں میں پہلے سے جاری تھی۔ محمد (ﷺ) کی اپنی تمام شادیوں میں سیاسی تعلقات میں اضافے کا مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے ساتھ شادی سے آپ کو دولت ملی اور مکی سیاست میں آپ کے اثر کا آغاز بھی اسی شادی سے ہوا۔ سودہ اور زینب بنت خزیمہ سے شادی کا سب سے بڑا مقصد مخلص مسلمانوں کی بیواؤں کو باوقار پناہ مہیا کرنا تھا لیکن سودہ کے خاوند کا بھائی ایک ایسا شخص تھا، جس کے متعلق محمد (ﷺ) یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کھل کر آپ کے مد مقابل آجائے اور زینب کے خاوند کا تعلق قبیلہ بنو مطلب سے تھا، جن کے متعلق محمد (ﷺ) کی خصوصی ذمہ داریاں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ محمد (ﷺ) زینب کے اپنے قبیلہ ”عامر بن صعصعہ“ کے ساتھ بھی اچھے تعلقات بنا رہے تھے۔ مدینہ میں

آپ کی پہلی دو بیویاں، عائشہ اور حفصہ، ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی صاحبزادیاں تھیں جن کے ساتھ محمد (ﷺ) کا خصوصی تعلق تھا۔ اُم سلمہ، صرف ایک مستحق بیوہ ہی نہ تھیں بلکہ وہ مکہ قبیلہ بنو مخزوم کے سردار کی رشتہ دار بھی تھیں۔ جویرہ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں، جن کے ساتھ محمد (ﷺ) کے تعلقات خصوصی طور پر بہت خراب تھے۔ زینب بنت جحش محمد (ﷺ) کی پھوپھی زاد ہونے کے علاوہ قبیلہ بنو عبد شمس کے حلیف قبیلہ کی فرد بھی تھیں، لیکن ان کے معاملے میں سماجی محرکات، سیاسی محرکات پر فوقیت لے گئے، کیونکہ اس شادی کے ذریعے محمد (ﷺ) یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آپ نے پرانی رسموں سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ مکہ قبیلہ عبد شمس اور ابوسفیان بن حرب خصوصی طور پر محمد (ﷺ) کی نظر میں تھے۔ ابوسفیان کی ایک بیٹی اُم حبیبہ تھی جو مسلمان تھی اور اس کی شادی زینب بنت جحش کے ایک بھائی سے ہوئی تھی۔ ان کا خاوند جب حبشہ میں فوت ہو گیا تو محمد (ﷺ) نے ایک قاصد حبشہ اس لئے بھیجا کہ اُم حبیبہ سے آپ کی شادی کے انتظامات کو آخری شکل دی جائے۔ میمونہ سے شادی بھی حضرت عباس سے آپ کے تعلقات کو مضبوط کرنے میں مدد دے سکتی تھی جو میمونہ کے برادر نسبتی اور محمد (ﷺ) کے چچا تھے۔ یہودی الاصل عورتوں صفیہ اور ریحانہ سے آپ کے تعلق کے مقاصد بھی سیاسی ہو سکتے ہیں۔“ ۲۸

منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کی ہر شادی کے بارے میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آپ کی ہر شادی کا مقصد علمی،

سیاسی اور سماجی تھا۔

مشہور مستشرق جان بیگٹ گل (John Bagot Glubb) نے اپنی کتاب ”دی لائف ٹائمز آف محمد (ﷺ) (The life times of Muhammad)“ میں حضور ﷺ کی شادیوں کو تمام پہلوؤں سے دیکھ کر ان کے متعلق بڑے حقیقت پسندانہ تبصرہ کئے ہیں۔ ان کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

“The question of the marriages of the Messenger of God has aroused intense discussion and heated resentments into which we need not enter. It is, however, worthy of note that of all his wives, only Aisha was a virgin when he married her. Zainab bint Jahash was a divorced wife and all the rest were widows, some of them, it would seem, not particularly attractive. Moreover, the apostle had married Khadija when he was twenty-five and she was a widow considerably older than he was. He had remained completely faithful to her for twenty-four years until her death. ۲۹

”پیغمبر (ﷺ) کی شادیوں کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہم اس بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتے تاہم، یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کے وقت آپ کی بیویوں میں سے صرف عائشہ کنواری تھیں، زینب بنت جحش مطلقہ تھیں اور باقی تمام بیوہ تھیں۔ ان میں سے کچھ زیادہ پرکشش بھی نہ تھیں۔ مزید برآں، پیغمبر ﷺ نے خدیجہ سے پچیس سال کی عمر میں شادی کی

تھی، جو اس وقت بیوہ تھیں اور عمر میں آپ سے کافی بڑی تھیں۔ پیغمبر (ﷺ) ان کی وفات تک چوبیس سال کا عرصہ، ان کے ساتھ مکمل طور پر وفادار رہے۔“ ۳۰

ایک اور جگہ مزید لکھتا ہے:

“It is noticeable that the apostle, when a young man, had six children by Khadija, yet he had no children by the twelve women, who followed her, except for a son by Mary, the Egyptian concubine, most of his wives, though not in their first youth, were capable of bearing children. In Medina, Muhammad had less and less leisure time and must often have been mentally and physically exhausted, especially as he was in his fifties and laterly over sixty. These are not the circumstances under which men are interested in the indulgence of extreme sexuality.” ۳۱

”یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ پیغمبر (ﷺ) جب نوجوان تھے تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے بطن سے ان کے چھ بچے تھے، لیکن ان کے بعد ماریہ قبطیہ سے ایک بیٹے کے علاوہ بارہ عورتوں سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آپ کی اکثر زوجات کو بالکل نوجوان تو نہ تھیں، البتہ وہ بچوں کو جنم دینے کے قابل تھیں۔ مدینہ میں محمد (ﷺ) کو فرصت کا وقت بہت کم ملتا تھا اور اکثر اوقات آپ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت زیادہ تھکے ہوئے ہوتے ہوئے خاصاً جب کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ حالات ایسے نہیں جن میں مرد زیادہ جنسی تعلقات کی طرف رغبت محسوس کرتے ہوں۔“ ۳۲

ایک حدیث کی رو سے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اس دنیا میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔“ جان بیگٹ گلب اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

“The connection of his love of women with prayer seems to prove that it never occurred to him that his fondness for female company could be anything but innocent.” ۳۳

”آپ کا عورتوں کی محبت کو عبادت کے ساتھ جمع کرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ کا عورتوں کی معیت کا شوق بالکل معصوم تھا۔“ ۳۴

نقشہ ازواجِ مطہرات:

نمبر شمار	ازواجِ مطہرات	سنہ نکاح	عمر بوقت نکاح	سنہ وفات	مقبرہ	مدت رفاقتِ نبوی ﷺ	رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک بوقت نکاح
۱۔	حضرت خدیجہ الکبریٰ	میلاد النبی ۲۵	۴۰ سال	۱۰/ جنوری	مکہ	تقریباً ۲۵ سال	۲۵ سال

۲۔	حضرت سودہ	نبوت ۱۰	۵۰ سال	ہجرت، ۱۹ھ	مدینہ	۱۴ سال	۵۰ سال
۳۔	حضرت عائشہ صدیقہ	نکاح ۱۱/نبوی، رخصتی شوال ۱ھ	۹ سال	۱۷/رمضان ۵ھ	مدینہ	۹ سال	۵۳ سال
۴۔	حضرت حفصہ	شعبان ۳ھ	۲۳ سال	۴۵/ہجری	مدینہ	۸ سال	۵۵ سال
۵۔	حضرت زینب بنت خزیمہ	۳ھ	تقریباً ۳۰ سال	۳ھ	مدینہ	۳ ماہ	۵۵ سال
۶۔	حضرت ام سلمہ	۴ھ	۲۴ سال	۶۰ھ	مدینہ	۷ سال	۵۶ سال
۷۔	حضرت زینب بنت جحش	۵ھ	۳۶ سال	۲۰ھ	مدینہ	۶ سال	۵۷ سال
۸۔	حضرت جویریہ	شعبان ۵ھ	۲۰ سال	ربیع الاول، ۵۶ھ	مدینہ	۶ سال	۵۷ سال
۹۔	حضرت ام حبیبہ	۶ھ	۳۶ سال	۴۴ھ	مدینہ	۶ سال	۵۸ سال
۱۰۔	حضرت صفیہ	جمادی الاخر، ۶ھ	۱۷ سال	رمضان، ۵۰ھ	مدینہ	۳/۴ سال	۵۹ سال
۱۱۔	حضرت میمونہ	ذیقعدہ، ۷ھ	۳۶ سال	۵۱ھ	مکہ	۱/۴ سال	۵۹ سال
۱۲۔	علاوہ ازیں حضرت ماریہ قبطیہ	۶ھ	۲۰ سال	۱۶ھ	مدینہ	۵ سال	۵۹ سال

حوالہ جات:

- ۱۔ ڈاکٹر محمد شہباز منج، فکر استشرق اور عالم اسلام میں اس کا اثر و نفوذ، لاہور، القمر پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص: ۳۵
- ۲۔ حافظ سیف الاسلام، تحریک استشرق کی حقیقت اور استشرقی لٹریچر کے اثرات، پاکستان، دارالعلوم اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۲۰۱۵ء، ص: ۳۹
- ۳۔ القرآن۔ سورۃ الاحزاب آیت ۵۰
- ۴۔ القرآن۔ سورۃ الاحزاب آیت ۵۱
- ۵۔ القرآن۔ سورۃ الاحزاب آیت ۵۲

۶۔ P:126 Muhammed & Islam, Muir, Sir William, 1887, The Religious Trivet Society,

۷۔ پیر محمد کرم شاہ لازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۴۶۹

۸۔ بائبل (قدیم و جدید عہد نامہ) لاہور، بائبل سوسائٹی پاکستان، ۲۰۱۳ء

- ۹۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۴۷۲
- ۱۰۔ Sir William Muir, Muhammed & Islam, The Religious Trivet Society, 1887, P:126
- ۱۱۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۰
- ۱۲۔ Sir William Muir, Muhammed & Islam, The Religious Trivet Society, 1887, P:126
- ۱۳۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۱
- ۱۴۔ Sir William Muir, Muhammed & Islam, The Religious Trivet , 1887, P:126 - Society
- ۱۵۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۲
- ۱۶۔ Sir William Muir, Muhammed & Islam, The Religious Trivet Society, 1887, P:126
- ۱۷۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۲
- ۱۸۔ ایضاً، ص: ۵۳۴
- ۱۹۔ الشیخ محمد محمود الصواب، زوجات النبی الطہرات وحکمہ تعددہن، جدہ، دارالعر، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۴
- ۲۰۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۶
- ۲۱۔ منگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۳۳۱
- ۲۲۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۷
- ۲۳۔ W Montgomery Watt, Muhammad : Prophet and Statesman, Oxford University Press, 1961, P:158
- ۲۴۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۸
- ۲۵۔ منگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۳۳۰
- ۲۶۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۳۸
- ۲۷۔ منگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۲۸۸-۲۸۷
- ۲۸۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۴۱
- ۲۹۔ جان بیگٹ گل، دی لائف ٹائمز آف محمد، ہاڈرابینڈ سٹائلنگ، لندن، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۳۷
- ۳۰۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۴۲
- ۳۱۔ جان بیگٹ گل، دی لائف ٹائمز آف محمد، ہاڈرابینڈ سٹائلنگ، لندن، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۳۹
- ۳۲۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۴۲
- ۳۳۔ جان بیگٹ گل، دی لائف ٹائمز آف محمد، ہاڈرابینڈ سٹائلنگ، لندن، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۳۸
- ۳۴۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج: ۷، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۷ھ، ص: ۵۴۴

TEACHER OF ISLAM AND QUALITIES OF HIS TEACHINGS

معلم اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات کے معیارات

اعجاز علی سوڈھر ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک کلچر سندھ یونیورسٹی جامشورو
ڈاکٹر حافظ زین العابدین سوڈھر ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف لینگئینجز، سندھ یونیورسٹی جامشورو
علی انور شیخ شعبہ اسلامک کلچر سندھ یونیورسٹی جامشورو

ABSTRACT: There were many great teachers in the world. Prophets and founders of other religions and philosophers have also been passed. The teacher of Islam Hazrat Muhammad started a successful campaign as a teacher. He devoted his whole life to generalizing the commands of Almighty Allah and the teachings of Islam. The Holy Prophet as a teacher was the highest and most favorable. He was also the greatest of humanity. He taught Islamic teachings with words along with his own practical model. The quality of the Prophet's education was higher than the standard of education of the rest. Some of the features of the Prophet's teaching have been tried to show in this article.

KEYWORDS: Teaching, Practical model, Quality, Standard, Commands.

انبیاء کرام علیہم السلام انسانیت کے سب سے بڑے معمار رہے ہیں۔ ہر نبی اپنے دور کا بڑا معمار رہا ہے۔ انسانوں کو اصلی علوم سے آشنا کرنے والی ہستی نبی ہی کی ہوا کرتی ہے۔ نبوت نے انسانیت کو جن بھی تعلیمات سے نوازا وہ تعلیمات فرمان الہی پر مبنی ہوا کرتی ہیں۔ اس مقدس معلموں کی فہرست ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش^۱ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہمارے آقا ﷺ دنیا کے سب سے بڑے حقیقی اور سچے معلم تھے۔ آپ ﷺ کی تعلیم احکام ربانی، عقلی دلائل، اخلاقیات سے بھرپور، حکمت اور فطرت جیسی صفات سے سچی ہوئی ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیم کلام اللہ کی گہرائی اور رموز کو سمجھانے اور حکمت سے بھرپور ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے حکماء اور دانالوگ پیدا ہوئے۔ کچھ تو ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے لوگوں کو تعلیم دی اور صدیوں تک وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے ہیں۔ دنیا ان کے گن گاتی رہی ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں سب سے اہم بات ان کا قول کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے اور ہمارے آقا ﷺ کی تعلیمات کا مقام اپنی جگہ مگر آپ ﷺ کا عمل بھی امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ آپ ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی زندگی کے مقدس اور پاکیزہ کارنامے، آپ ﷺ کا عمل اور آپ ﷺ کے فیض کے بھی پاکیزہ اثرات ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ کی تعلیمات وہی ہیں جو آپ ﷺ کا عمل تھا۔ جو آپ ﷺ کے منہ مبارک پر تھا وہی آپ ﷺ کے قلب مبارک میں تھا۔ مطلب آپ ﷺ جو فرماتے تھے وہ کرتے بھی تھے۔ یہی اصل وجہ تھی جس کی بدولت آپ ﷺ کی تعلیم اور صحبت کا اثر خوشبو بن کر آپ ﷺ کے ہم نشینوں کو بھی مہکا دیتا تھا۔

معلم اسلام ﷺ کی بعثت سے پہلے انسانیت تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے خالق کی تعلیمات سے خالی تھی۔ اپنے مالک سے بھی انجان تھی۔ طاقت کے بل بوتے پر انسانیت کو تذلیل کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ صرف انا اور مفاد ہی مد نظر تھا۔ معلم اسلام ﷺ کی آمد سے انسانیت پھر سے جی اٹھی اور قیامت تک کی ابدی حیات حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ معلم اسلام ﷺ نے انسانیت کو وہ درس دیا جس کی بدولت دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی و کامرانی کو آسان طریقے سے حاصل کر سکتی ہے۔ آپ کی تعلیمات کو جس بھی ترازو میں تولاجائے یا جس بھی پیمانے سے ناپاجائے ہر لحاظ سے اس کو کامل ہی پایا جائیگا۔

دنیا میں سقراط، ارسطو، افلاطون اور دوسرے بھی بڑے بڑے دانا اور فلاسفر حضرات گزرے ہیں۔ ان حضرات کے اخلاقیات اور اعمال کو پڑھ کر کوئی ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا ہوگا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی مقدس تعلیمات اور اعمال کی بدولت متبعین حضرات بڑے بڑے درجے حاصل کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات و اعمال، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات و اعمال اور ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی تعلیم اور تلقین سے قوموں کی قومیں اپنا کردار، اخلاق اور زندگیاں بدل چکے ہیں۔ ہمارے آقا ﷺ کی شانِ معلیت سب سے نرالی رہی۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور اعمال کرہ ارض پر ایسی پھیلی کے آج بھی دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی کسی کے اندر حسن اخلاق کی کوئی کرن چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی طریقے سے آپ ﷺ ہی کی تعلیمات اور اعمال کے اثر کا نتیجہ ہے۔ ہمارے آقا ﷺ کی تعلیمات کے معیار کا مقابلہ دنیا کے کسی بھی معلم کی تعلیمات نہیں کر سکتی۔

نبوت کے کاموں میں سے اہم کام اور سبب الہی علوم کو متعارف کرانا ہے۔ اس تعلیم کے بغیر حق و باطل میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کبھی کسی کی بھی روحانی زندگی کی کوئی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔^۲ اس لئے ہمارے نبی کریم ﷺ تھے تو امی مطلب کے آپ لکھنا اور پڑھنا جانتے ہی نہ تھے مگر دنیا کے سب سے بڑے معلم بنے۔ علم الہی کے سب سے بڑے معلم ہماری نبی کریم ﷺ کی ہی ذات ٹھہری۔ خود نبوت کی مبارک زبان سے نکلا کہ انما بعثت معلماً، میں ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ فرمایا: وَاللّٰهُ الْمُعْطٰی وَ اَنَا الْفَاسِیْمُ۔^۳ اللہ ہی دینے والا ہے اور میں تو تقسیم کرنے والا ہوں۔ میں تو کتاب کی تعلیم دیتا ہوں۔ حکمت کی باتیں سکھاتا ہوں۔ نبوت کا اہم سبب انسانیت کو الہی علوم کی روشنی سے سرفراز کرنا ہی تھا۔

معلم اسلام ﷺ کے اندر اللہ رب العزت کی طرف سے ودیعت کردہ اوصاف اور خوبیوں کو دیکھا جائے تو سب اکمل درجے کی اس ذات کے اندر پائی جاتی ہیں۔ نبوت کا اختتام بھی معلم اسلام ﷺ پر ہی ہوا۔ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام مخصوص اوقات اور مخصوص علاقوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ نبوت کا بار جب ان منتخب شخصیات پر پڑا تو تکالیف بھی اس درجے کی برداشت

کرنا پڑیں۔ جتنی بڑی ذمیواری تھی تو بدلے میں مخالفوں کی طرف سے اتنے بڑے درد اور تکالیف ان کے حصے میں آئیں۔ معلم اسلام ﷺ کی نبوت قیامت تک باقی رہنی ہے اور پوری کائنات کے لئے نبی بنا کر مبعوث فرمایا گیا، تو تکالیف بھی اسی درجے کی حصے میں آئیں۔ معلم اسلام ﷺ کی استقامت بھی قابل تعریف رہی۔ انہوں نے مخالفت شروع کی۔ ہر طرح کی تکالیف اور ایذا پہچانے لگے۔ سوشل بائیکاٹ کیا گیا، بہتان لگائے گئے، چاہنے والوں کو بھی ستایا گیا۔ مطلب کہ جو ان لوگوں سے بن پڑا انہوں نے ہر حربہ استعمال کیا، حتیٰ کہ اس مقدس ہستی کو اپنے وطن سے بے دخل ہونا پڑا مگر یہ ہستی انسانیت کی سب سے بڑی محسن ہستی تھی، تو اس لحاظ سے سب کچھ برداشت کرتی رہی اور اپنے مشن کی تکمیل کی دھن میں مگن رہی۔

معلم اسلام ﷺ اور ان کے شاگرد

ہر معلم کی پہچان اس کے شاگرد ہی ہوا کرتے ہیں۔ شاگردوں کو دیکھ کر ان کے معلم کے کردار اور درجے کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ معلم کی شانِ رفعت شاگردوں میں جھلکتی ہوئی دکھتی ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کے شاگرد ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ انہوں نے دنیا کے اندر ایسی مثال پیش کی کہ انسانیت کے لئے عمل میں حجت بن گئے۔ ان کی زندگی بعد کے لوگوں کے لئے مشعل راہ بن گئی۔ ہر ایک صحابی سے تعلیمات رسول ﷺ عیاں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔⁴ اقدس ﷺ نے خود اپنے شاگردوں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا:

وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: “سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: سَأَلْتُ رَبِّي عَنْ اخْتِلَافِ أَصْحَابِي مِنْ بَعْدِي فَأَوْحَى إِلَيَّ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّ أَصْحَابَكَ عِنْدِي بِمَنْزِلَةِ النُّجُومِ فِي السَّمَاءِ بَعْضُهَا أَقْوَى مِنْ بَعْضٍ وَلِكُلِّ نَوْرٍ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنْ اخْتِلَافِهِمْ فَهُوَ عِنْدِي عَلَى هُدًى قَالَ: وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيُّهُمْ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ».”⁵

ترجمہ: “حضرت عمر فاروق نے بیان فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: میں نے اپنے بعد اپنے صحابہ کے درمیان اختلاف کے متعلق اپنے رب سے پوچھا تو میرے رب نے میری طرف یہ وحی فرمائی: اے میرے نبی! میرے نزدیک آپ کے صحابہ آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے کچھ ایک دوسرے سے زیادہ قوی ہیں اور ہر ایک ستارے کی اپنی روشنی ہے۔ اب ان کے درمیان جو اختلاف ہے جس پر یہ لوگ قائم ہیں کوئی شخص بھی عمل کریگا تو وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔ راوی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ تم لوگ ان میں سے جس بھی صحابی کی اقتدا کرو گے تو ہدایت کو پالو گے۔”

یعنی اپنے شاگردوں کی زندگیوں اور اعمال پر معلم ﷺ کو اتنا اعتماد تھا کہ ان میں سے کسی بھی شاگرد کی اتباع کو کامیابی قرار دیا۔ یہ ہوتی ہے کامیاب معلم کی شان کہ وہ اپنے شاگردوں کے بارے میں کلی اعتماد رکھتا ہو۔ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم یعنی

شاگردوں پر اعتماد اللہ رب العزت نے بھی ظاہر فرمادیا۔ اب اس سے بڑھ کر ان حضرات کی دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ شاگرد بھی ایسے رہے کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو حاصل کردہ تعلیمات کا عملی نمونہ بنا ڈالا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ صرف تقریر کے ذریعے نہیں بلکہ عمل کے ذریعے بھی اپنے معلم ﷺ کی تعلیمات کی تبلیغ کرتے رہے۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ کامیاب ترین معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی صرف کر چکے ہیں اور ان کے شاگردوں نے بھی آپ کی تعلیمات کو جب آگے منتقل کیا تو اپنے عمل سے ان کو سکھایا۔ شاگردوں کے شاگرد بھی ایسے ہی نکلے کہ انہوں نے اپنے استادوں کے استاد ﷺ کی زندگی کے ہر ایک پہلو کو ایسا محفوظ کر دیا کہ رہتی دنیا تک کے لوگوں کے سامنے اس عظیم معلم ﷺ کی زندگی کا ہر ایک پہلو صاف اور سامنے ایسے رہے گا جو بالکل ہی کی بات ہے۔⁶ شاگردوں کے شاگردوں نے بھی اپنی پوری کی پوری زندگیاں محسن انسانیت ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کو محفوظ کرنے میں صرف کر دیں۔⁷ اس عظیم محسن انسانیت اور معلم ﷺ کی تعلیمات اور زندگی کے مندرجہ ذیل معیار پائے جاتے ہیں جو آپ ﷺ کی رفعتِ شان کی بھی کھلی گواہی ہیں۔

معلم اسلام ﷺ نے اپنے شاگردوں کو تعلیم دی، ان کی قابلیتوں کو نکھارا، ان کو کامل انسان بنایا۔ آپ ﷺ سے تعلیم پا کر آپ ﷺ ہی کے ساتھ ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس جماعت کی رہنمائی اور امامت آپ ﷺ ہی کرتے رہے۔ معلم اسلام ﷺ نے اس جماعت کو قرآن مجید کے پروگرام پر چلایا۔ یہ جماعت قرآن مجید پر عمل پیرا رہی۔ اس پروگرام میں انسانیت کی خدمت، مظلوموں کی دادرسی، ظالم کو ظلم کرنے سے باز رکھنا، انصاف دلانا اور اللہ رب العزت کے قانون کو نافذ کرنے جیسے قرآنی پروگرام شامل تھے۔ معلم اسلام ﷺ نے اپنے شاگردوں کو صاف طور پر یہ بتا دیا تھا کہ اس پروگرام کے تحت کام کرنے کے بعد اس پورے کام کا بدلہ صرف اپنے خالق سے ہی مانگنا۔ اس پروگرام پر اگر صحیح اور ٹھیک طریقے سے کام کرتے رہو گے تو کامیابی کی بشارت سن لو اور اس دنیا اور آخرت میں بھی اس کام کے فوائد ملیں گے اور اگر اس قرآنی تعلیمات کے پروگرام پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلو گے تو اس دنیا اور آخرت میں ناکام زندگی کے لیے تم لوگوں کو خبردار کر رہا ہوں۔⁸ دنیا میں ہر کام سیکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر کام کسی نہ کسی سے سیکھا جاتا ہے۔ یعنی استاد کے بنا انسان کچھ بھی سیکھ نہیں سکتا، حتیٰ کہ اپنے جسم پر پہنے جانے والے کپڑے بھی خود کے لئے نہیں سی سکتا۔ یہ بھی کسی سے سیکھنا پڑتا ہے۔ مطلب کے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی سیکھ کر سرانجام دیا جاتا ہے۔ معلم ایک سیڑھی کی مانند ہوتا ہے، جس کے سہارے انسان کوئی بھی منزل حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام انسان کو اپنے خالق سے ملنا چاہتا ہے، انسان کو اپنے مالک کی طرف سے طے کردہ راستے پر چلنا چاہتا ہے۔ اپنے مالک کی چاہت بتانا چاہتا ہے۔ اپنے مالک کی ممنوعات سے روکتا ہے۔ مطلب کے انسان کو اپنے خالق کی پہچان اور انسان کو پیدا کرنے کی اصل وجہ بتا کر کامیابی کی طرف گامزن کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے لئے انسان کو ایک ایسے معلم کی ضرورت ہے جو اس کو اس پورے پروگرام میں رہنمائی کر کے کامیابی تک پہنچائے۔ اس کے ساتھ

یہ بھی لازم تھا کہ معلم کے اندر اتنی قابلیت ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کو منزل تک پہنچا سکے۔ ایسی خوبیوں والے معلم کا انتخاب خود خالق کائنات نے اپنی مرضی سے ہی کیا۔ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ اس معلم کی اپنی چاہت ہوئی اور کوشش کر کے اپنی محنت سے معلم بن گیا، بلکہ یہ انتخاب خالق کی اپنی منشا تھی۔ اسلام کے معلم ﷺ کو جن کر اس کے اندر ایسی خوبیاں اور اوصاف بھی ودیعت کر دیئے جو اس پروگرام کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

معلم اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات

اللہ رب العزت نے اسلام کی تعلیمات دینے کے لئے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کا انتخاب کیا۔ انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر ساری خوبیاں اور اوصاف بھی ودیعت فرمادیئے۔ اپنے نبی ﷺ کو شاہد، بشیر اور نذیر بنا کر مبعوث فرمایا۔ اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کے دلوں میں اپنی محبت ڈال دی۔ اب ان بندوں کو ایک معلم کی ضرورت تھی کہ جو ان کو یہ سیکھا سکے کہ محبت کیسے کی جائے، اس محبت کے تقاضے کیا ہیں، اس محبت میں کیا کیا کرنا پڑتا ہے، اس محبت کی اصل معراج کیا ہے، اس محبت کا کیا طریقہ ہونا چاہیے وغیرہ یہ سب باتیں سیکھانے کے لیے معلم ہی وہ ہستی ہے جو یہ سب باتیں احسن طریقہ سے سکھا سکتی ہے۔ معلم اسلام ﷺ نے بندوں کو اپنے خالق سے جوڑا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کی تدریس اپنی قوم اور اپنے شہر کے لوگوں سے شروع کی۔ آہستہ آہستہ اپنے اس تعلیم سے آراستہ ہونے لگے۔ اس کے بعد اپنے ان شاگردوں کے ساتھ ملکر اسلامی تعلیمات کا دائرہ وسیع کرتے گئے۔ آپ ﷺ کی شاگردی میں اپنے یعنی قریش اور مکہ کے کچھ لوگ آئے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کے لوگ پھر آہستہ آہستہ یہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ معلم اسلام ﷺ بحیثیت معلم کامیاب ترین معلم رہے۔ آپ ﷺ نے اسلامی تعلیمات کو اپنے شاگردوں میں احسن طریقے سے منتقل کیا۔ آپ ﷺ نے جو کامل انسانوں کی جماعت تیار کی، اس جماعت کی کامیابی اور ترقی کی مثال انسانیت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح کی کہ وہ اپنا سب کچھ اسلامی تعلیمات اور اس کے فروغ کے لئے قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے اور اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ انہی جان نثار شاگردوں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی تعلیمات دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکی ہیں۔ آپ ﷺ نے ایسے ایسے شاگرد تیار کیے جو خود اپنی ذات میں ایک پوری جماعت تھے۔⁹ آپ ﷺ کے شاگرد اپنے وقت کے بڑے بڑے حقیقی فرمان روا بنے، بڑے بڑے منصف بنے، علوم کے سمندر بلکہ مہاساگر بنے۔ مطلب کے ہر شاگرد کے اندر بہت سی خوبیاں اعلیٰ ترین درجے کی موجود تھیں۔ ایک ایک شاگرد آپ ﷺ کی پہچان بنا۔ ان شاگردوں نے خود کو فدا کر دیا تھا۔ اپنے معلم ﷺ کی ہر تعلیم اور حکم پر فدا تھے۔ اپنا سب کچھ لٹاتے رہے اور دنیا نے دیکھا کہ ان شاگردوں نے دنیا میں بھی کامیابی حاصل کی تو آخرت کی سرداری بھی انہی کے حصے میں آئی۔

معلم اسلام ﷺ کی صداقت کی دلیل

معلم اسلام ﷺ کی اپنی صداقت ایک مسلم حقیقت ہے۔ اس صداقت کے بہت سے دلائل ملتے ہیں۔ مصنفین حضرات نے اس موضوع کو منتخب کر کے بہت سی مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ آج تک اس معلم انسانیت ﷺ کی زندگی اور کردار پر بہت سی تصانیف سامنے آچکی ہیں۔

معلم اسلام ﷺ کی زندگی اہل مکہ کے سامنے رہی۔ اس سابقہ زندگی کو سامنے رکھ کر پورا مکہ آپ ﷺ کو صادق اور امین جیسے اعلیٰ القاب سے یاد کیا کرتا تھا۔ آپ ﷺ کی سابقہ زندگی مثالی زندگی تھی۔ لوگوں کی زبان پر آپ ﷺ کے لیے تعریفی کلمات ہی ہوا کرتے تھے۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب آپ ﷺ کے حسن اخلاق اور صداقت کے معترف تھے۔ معلم اسلام ﷺ نے جب الہامی دعوت کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا تو اللہ رب العزت کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی کہ آپ اپنی قوم کو الہامی دعوت پیش کریں تو ان کو یہ بات بھی سامنے پیش کریں کہ: **فَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْنَا وَلَا آتَاكُمْ بِهِمْ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ** (۱۶) ¹⁰

ترجمہ: “آپ کہہ دو کہ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس قرآن کو میں تم لوگوں کو پڑھ کر نہ سنانا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اس سے واقف کرا دیتا۔ پس بیشک میں اس سے پہلے بھی تم لوگوں کے بیچ میں اپنی عمر کا ایک عرصہ گزار چکا ہوں، پھر تم لوگ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟”

اللہ رب العزت نے یہ حکم فرمایا کہ اے میرے محبوب! تیری صداقت کے ثبوت کے لئے میری گواہی سے بڑھ کر کوئی اور چیز اہمیت ہی نہیں رکھتی مگر آپ اپنی قوم کو یہ بتائیں کہ تم لوگ ساری باتوں کو چھوڑ دو بس اس بات پر ہی غور کرو کہ میں تم لوگوں کے درمیان کا بندہ ہوں، کوئی نیا بندہ یا باہر سے آیا ہوا انسان نہیں۔ میرے حالات اور سارہ کردار تم لوگوں کے سامنے ہے۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا، بول چال، لین دین، رویہ کردار اور اخلاق اعمال مطلب کے ساری زندگی ہی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ میں تم لوگوں کے سامنے ایک کھلی کتاب ہوں۔ تم لوگ اس کے گواہ ہو۔ میری عمر کا یہ سابق عرصہ میری سچائی، ایمانداری، رواداری، صلہ رحمی، امانت اور دیانت وغیرہ جیسے عمدہ اخلاق سے بھرپور ہے، جو تم لوگوں نے میرے اندر دیکھے ہیں۔ کوئی بری بات یا برا کردار تم لوگوں نے میرے اندر نہیں دیکھا۔ میں نے ہمیشہ سے سچی بات ہی کی ہے۔ میرے اس کردار کی وجہ سے تم لوگوں نے ہی مجھے صادق بھی کہا اور امین بھی کہا۔ صرف کہنے کی حد تک نہیں بلکہ امین اور صادق تم لوگوں نے میرا لقب بنا ڈالا ہے۔ میں تم لوگوں کے درمیان صادق اور امین کے لقب سے ہی جانا جاتا ہوں۔ تم لوگوں نے خود دیکھا ہے کہ میری سابقہ زندگی میں کبھی مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ میں کسی بھی انسانی معاملے میں جھوٹ سے کام لوں۔ تو اب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں خالق کائنات پر کوئی تہمت یا بہتان باندھنے لگوں یا

اپنے مالک پر جھوٹ بولنے لگوں؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں یہ جھوٹ بولوں کہ مجھ پر میرے خالق کا کلام نازل ہوتا ہے۔ تو اب تم لوگ اپنی عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ میری بات کی صداقت آپ لوگوں کے سامنے بالکل واضح ہے۔

معلم اسلام ﷺ کی ان باتوں کو سامنے رکھ کر اہل عقل اور ذی شعور لوگ یہ بات تو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ انسانی عمر کے شر و عاقی چالیس برس بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں انسان کے اخلاق اور کردار کی خامیاں اور خوبیاں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ انسانی عادات ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ عادات اس عمر کے پہنچنے تک پنپنے ہو جاتی ہیں۔ انسان کی خامیاں یا خوبیاں لوگوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اس معلم اسلام کی چالیس سال تک کی زندگی تو ہمارے سامنے رہی۔ اتنے عرصے تک تو ہم نے اس کو صادق اور امین ہی پایا۔ اب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ چالیس سالوں کے بعد وہ یکدم سے اتنا بڑا کذاب بن جائے یا اتنا بڑا بہتان باندھنے لگے اور جھوٹ بھی کسی عام چیز کا نہیں بلکہ خالق کائنات کے کلام کے نازل ہونے کا۔ خود کو اس کا رسول ماننے کا۔ وہ خالق جس کی عظمت کا وہ خود ہی اعتراف کرتا ہے، خود ہی جس کو اپنی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان کا بھی مالک مانتا ہے، جس کے غصے اور قہر سے ہر وقت خود بھی ڈرتا ہے اور دوسروں کو بھی ڈراتا ہے، ہر وقت اور ہر معاملے میں اس مالک کی رضا کو ہی ملحوظ رکھتا ہے، دن ہو یا رات اس مالک کی عبادت میں مشغول ہی رہتا ہے، ہر عمل کرنے کے بعد اس کی کمیوں اور کوتاہیوں کی بھی اس مالک سے معافی مانگ رہا ہوتا ہے۔ اس مالک کی ہی باتیں اور ذکر ہر وقت اپنی زبان پر رکھتا ہے۔ ہماری عقل تو اس بات کو مان ہی نہیں سکتی کہ وہ کوئی بہتان باندھ رہا ہے یا کوئی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اپنی بات میں بالکل سچا تو ہے پر ہم لوگ کیسے اس کی بات مان کر اسی پر ایمان لائیں جس کی وہ دعوت دیتا ہے۔ ہم کیسے اپنے آباء و اجداد کے دین سے متنفر ہو جائیں؟ کیسے اپنے معبودوں کا انکار کریں؟

یہ بات تو واضح ہے کہ اسلام کے اس عظیم معلم ﷺ کی صداقت کے معترف تو تقریباً سارے عرب کے لوگ تھے۔ بس اپنی انا اور اپنے آباء و اجداد کے دین سے انحراف اور اپنے آپ کو اس کے ماتحت کرنے کی وجہ سے ایمان نہیں لارہے تھے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کبھی بھی کسی بھی انسان نے آپ ﷺ کو جھوٹ بولنے والا نہیں کہا اور نہ ہی کبھی کسی کے دل نے یہ گواہی دی۔ بس ان کو اپنی انا بہت پیاری تھی جو ان لوگوں کو محسن انسانیت کے خلاف کھڑا کر رہی تھی۔ سب لوگ یہ بھی مانتے تھے کہ وہ اپنے ہر قول میں سچا ہے۔ اس کا پیش کردہ کلام بھی بالکل سچا ہے۔ اس کا کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام اور دین کی تصدیق اور توثیق ہے۔

اپنی زندگی اور کردار کو دلیل کے طور پر پیش کرنے کی ہمت تو صرف وہی انسان کر سکتا ہے جس کو اپنی زندگی اور کردار پر کلی اعتماد ہو اور وہ حقیقت میں سچا بھی ہو۔ خود کو اپنی سچائی پر پورا کا پورا یقین بھی ہو۔ اس کے کردار اور عمل کی کبھی ضمیر نے مخالفت بھی نہ کی ہو بلکہ جس کے قول و عمل سے اپنا ضمیر بالکل مطمئن رہا ہو وہی ایسی دلیل پیش کر سکتا ہے۔ معلم اسلام ﷺ کی تعلیم کے معیار اور

صداقت کی سب سے بڑی اور اہم دلیل تو خود معلم کی سابق زندگی ہی ہے۔ جس کو وہ بطور دلیل پیش کر چکا تھا۔ اس کی تعلیم اور صداقت کی گواہی خود کلام اللہ نے دی۔ یہ وہ دلیل ہے جس سے بھی انکار کھلی حماقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ معلم اسلام ﷺ کے مخاطب اول عرب لوگ ہی تھے۔ ان کی مادری و پدری زبان ہی عربی تھی۔ وہ اپنی قوم اور زبان پر اپنی جان تک قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہنے والی قوم تھے۔ وہ فصیح و بلیغ اہل زبان تھے۔ وہ کلام اللہ کے مصداق اول ٹھہرے۔ وہ کلام اللہ کو بہت اچھی طرح سے سمجھتے بھی تھے۔ قرآن مجید جو کلام اللہ ہے وہ پورا کا پورا حق پر مبنی ہے۔ اس بات کو ماننے والے غیر بھی تھے۔ جب ان غیروں کے کانوں میں کلام اللہ کی آواز آتی تھی تو دل اور زبان بے ساختہ بول اٹھتے تھے کہ ماہذا کلام البشر: یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ کسی انسان کا کلام ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید اسلامی تعلیمات کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ذریعہ ہے۔ قرآن مجید اسلامی تعلیمات، اسلامی قانون اور خالق کائنات کے احکامات کا ذریعہ ہے۔ اس پر معلم اسلام ﷺ نے خود عمل کر کے اس کی تعلیمات کو عام کرنے کی تعلیم اور ترغیب دی۔

شاگردوں کے سامنے بے پردہ عملی زندگی

دنیا میں سوا لاکھ کے قریب انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان لانے والے بھی بہت زیادہ تعداد میں رہے ہیں۔ ان کے صحابہ اور حواری بھی ان ہی کے شاگرد ہیں۔ دنیا میں دوسرے مذاہب کے بھی بانی گزرے ہیں۔ بڑے بڑے دانا لوگ اور فلاسفر بھی گزرے ہیں، ان کی پیروی کرنے والے بھی لوگ کثیر تعداد میں گزرے ہیں اور موجود ہیں، مگر کسی کی بھی اخلاقی اور عملی زندگی کے بارے میں توثیق سے کہنا مشکل ہے ان کی زندگیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے تو پتا چلے گا کہ کسی بھی دوسرے نبی، مذہب کے بانی یا فلاسفر کی بھی زندگی ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے برابر جامع کمالات نہیں۔ دنیا میں آنے والے دوسرے انبیاء، دوسرے مذاہب کے بانی اور فلاسفوں کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے نہیں، مگر ہمارے رسول کریم ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح ہے گویا آپ ﷺ خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام پر تو ایسے الزامات اور تہمت لگائی گئیں جو ان کی شان کے خلاف تھے۔ قرآن مجید نے ان پر لگائے گئے بیہودہ الزامات اور تہمتوں سے ان کو پاک اور بری قرار دیا۔ مذاہب کے بانی جن کے مذاہب خاص کر کے چین، ہندوستان اور ایران میں پھیلے ہوئے ہیں، اگر ان کی زندگیوں کے بارے میں پتہ کرنا چاہیں تو سوائے مایوسی کے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ بس صرف کچھ سنی سنائی باتیں ہیں جو ان کی طرف منسوب ملیں گیں۔ ان سب کے مقابلے میں اسلام کے اس معلم ﷺ کی زندگی ایسی ہے جس کا ہر ایک عمل، ہر ایک قول اور ہر ایک بات محفوظ ہے۔ اس عظیم معلم ﷺ کی زندگی روز روشن کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے عیاں ہے۔ اس بات کا اعتراف انہوں کے ساتھ غیر بھی کرتے ہیں۔ اس معلم ﷺ نے خود اپنے شاگردوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ مجھے جو کام بھی خلوت میں بھی کرتے ہوئے دیکھو یا سنو وہ علی الاعلان دوسروں تک بھی پہنچایا کرو۔ بند کمرے میں سنو یا دیکھو وہ مجموعوں میں بیان کر دیا کرو۔

یہ آپ ﷺ کی شانِ معلمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے خود ہی اپنے سب شاگردوں کو کھلی اجازت دے رکھی تھی کہ مجھے جیسا بھی کرتے ہوئے دیکھو، جو بھی بولتے ہوئے سنو، جو بھی کسی کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے پاؤ وہ کھلم کھلا بیان کر دیا کرو۔ دوسروں کو اس کی خبر کر دیا کرو، بعد میں بھی آنے والوں تک میری ہر بات اور ہر عمل کو پہنچا دینا۔ یہ تھا اپنی پوری زندگی کو اپنے شاگردوں کے سامنے کھول کر رکھ دینا۔ اس کی نظیر پوری دنیا میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کے معیار کی ایک مثال ہے۔

اپنی تعلیم پر خود کا عمل

ہمارے آقا ﷺ کی تعلیم کے معیار کو اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ خود جو تعلیم دیا کرتے تھے اس پر اپنا کتنا عمل موجود ہے۔ تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ آپ ﷺ کی عملی زندگی کا بھی ہر ایک پہلو آج بھی محفوظ ہے۔ جس کا بھی جی چاہے وہ آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ اسلام کے معلم ﷺ نے اپنی تعلیمات پر خود عمل کیا۔ ایسا بھی ہر گز نہیں کہ اپنی تعلیمات میں سے صرف کچھ باتوں پر عمل کیا باقی صرف زبانی فرمادیں بلکہ آپ ﷺ کو زندگی میں جس بھی تعلیم پر عمل کرنے کا موقع ملا یا عمل کرنا ممکن ہوا آپ ﷺ نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ دنیا میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں، انہوں نے اپنی باتیں پر تاثیر بیانات ہے میں بھی بیان کیں۔ اپنے معتقدین کو نصیحتوں میں بھی سمجھایا، تمثیلیں بیان کیں۔ سابقہ لوگوں کے اعمال کی بھی مثالیں پیش کیں مگر آج تلاش کرنے سے بھی ان کے خود کے عمل کا ثبوت پیش کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انہوں نے بالکل بھی عملی نمونہ پیش نہ کیا ہوگا، اس بات سے کوئی مفر نہیں کہ کچھ باتوں پر عمل بھی ضرور کیا ہوگا مگر ان باتوں کو محفوظ نہ کیا گیا مگر اسلام کے اس عظیم معلم ﷺ کی رفعتِ شان اس حیثیت سے بھی بہت بلند نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات اور نصائح میں جو کچھ بھی کہا اس پر سب سے پہلے عمل کر کے بھی دکھایا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس طعنے سے آپ ﷺ بھی محفوظ نہ رہتے کہ دوسروں کو تو تعلیم دی حکم کیا مگر اس پر خود کوئی عمل نہ کیا۔ جیسے یہودیوں کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا: اَتَا مَرُؤْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ¹¹

ترجمہ: “تم لوگ دوسرے لوگوں کو بھلائی اور نیکی کا حکم کرتے ہو اور اس معاملے میں خود کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ تم لوگ (میری نازل کردہ) کتاب کو پڑھتے بھی ہو، پھر تم لوگ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟”

یعنی جو تم دوسروں کو کہتے ہو پہلے اس پر خود بھی تو عمل کرو۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو بھی آپ ﷺ کا قول تھا وہی آپ ﷺ کا عمل بھی تھا۔ اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو مخاطب ہو کر فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (۲) كَبِيرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ اَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۳)¹²

ترجمہ: ”اے وہ لوگ جو ایمان لائے! ایسی بات کیوں کہتے جو تم خود نہیں کرتے ہو۔ یہ بات اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ جو کام تم نہیں کرتے اس کام کا حکم دوسرے لوگوں کو کرو۔“

معلم اسلام ﷺ کی زندگی اور عمل کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہم سے حضرت حکیم بن فلح نے آکر پوچھا کہ یا اُمُّ الْمُؤْمِنِينَ، حَدَّثِينِي عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَارِے نبی کریم کے اخلاق کیا تھے؟ یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ ”أَلَسْتَ تَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟“ کیا تم نے قرآن مجید نہیں پڑھا؟ ”فَإِنَّ خُلُقَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ الْقُرْآنَ“¹³ قرآن مجید رسول اللہ کے اخلاق ہی ہیں۔

آپ ﷺ کے اخلاق قرآن مجید میں الفاظ کی صورت میں موجود ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت کی عملی صورت قرآن مجید ہی ہے۔ اب قرآن مجید دیکھا جائے تو اس میں کامیاب زندگی کے سب طور طریقے موجود ہیں۔ حسن اخلاق کے احکامات بھی موجود ہیں۔ دنیا و آخرت کی کامیابی کے راز مضمّن ہیں۔ مطلب کے حسن اخلاق کا عمدہ ترین مثال قرآن مجید ہے اور قرآن مجید معلم اسلام ﷺ کے اسلامی تعلیمات پر عمل کا ثبوت ہے۔ قرآن مجید پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید میں فرائض پر عمل کرنے کے احکامات ہیں۔ مساکین اور نادار لوگوں کی اعانت کرنے کا حکم ہے۔ آپ ﷺ نے ان احکامات پر احسن طریقے سے عمل کر کے دکھایا۔ قرآن نے حکم دیا کہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ آپ ﷺ نے اپنے پڑوسیوں سے مثالی سلوک کر کے عملی نمونہ پیش کیا۔ قرآن مجید میں اپنے دشمن اور قاتل کو معاف کرنے کی نصیحت اور ترغیب دی۔ آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کو معاف کیا۔ اپنے قریبی رشتے داروں کے قاتلوں کو بھی معاف کیا، حتیٰ کہ خود کو زہر دینے والوں تک کو بھی معاف کر کے عمل کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات کی خاطر کبھی بھی کسی سے انتقام تک نہ لیا۔ آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے، تلواریں چلائیں گئیں پھر بھی معاف کیا۔ قرآن مجید نے بوکھوں کو کھلانے کی ترغیب دی، آپ ﷺ نے خود بوکھا رہ کر بھی دوسروں کو کھلایا۔ خود کو اشد ضرورت تھی مگر پھر بھی اپنی چادر کا ندھوں سے اتار کر دوسرے کے حوالے کی۔ اس جیسی بہت زیادہ مثالیں آپ ﷺ کی سیرت میں موجود ہیں۔ آپ ﷺ نے ہر حکم پر خود عمل کر کے نمونہ پیش کیا۔ آپ ﷺ کے ہر قول پر آپ ﷺ کا عمل موجود ہے۔ آپ ﷺ کے شاگردوں نے آپ ﷺ کے عمل کو بھی اپنے بعد میں آنے والوں تک پہنچایا۔ آپ ﷺ کے شاگردوں کے شاگردوں نے آپ ﷺ کے عمل کو بھی قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ آج بھی مسلمان اللہ رب العزت کے احکامات، قرآن مجید اور اپنے نبی کریم کے اقوال اور تعلیمات کو پیش کرتے ہیں تو ساتھ میں معلم اسلام کے عمل اور فعل کو بھی پیش کرتے ہیں اور ان سب کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ صرف اپنے نبیوں علیہم السلام یا بانی مذاہب یا فلاسفوں کے اقوال اور تعلیمات کو پیش کرتے ہیں مگر معلموں کی عملی زندگی سنا کر اس کی دعوت نہیں دیتے۔ معلم اسلام ﷺ نے جیسے خود عملی نمونہ پیش کیا بلکل اسی

طرح آپ ﷺ کے شاگردوں نے بھی عملی نمونہ پیش کر کے اسلام کی طرف دعوت دی۔ معلم اسلام ﷺ کے عمل کے بارے میں قرآن مجید نے آپ ﷺ ہی کی زبانی آپ ﷺ ہی کے سامنے اس وقت کے لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا: ۱۴. تَعْقِلُونَ ۱۴. ترجمہ: میں آپ لوگوں کے بیچ میں اپنی عمر کا ایک عرصہ گزار چکا ہوں، کیا تم لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

جزیرہ عرب کے مشرکین معلم اسلام ﷺ کی سچائی، دیانت اور فضیلت کے منکر نہ تھے۔ سب آپ ﷺ کو امین اور صادق جیسے القاب سے یاد کیا کرتے تھے، ۱۵. حتیٰ کہ آپ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ابو جہل بھی آپ ﷺ کو سچا مانتا تھا۔ مشرکین کو انکار تھا تو یہ کہ آپ ج و باتیں پیش کر رہے ہیں ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کی صداقت کی سب سے زیادہ واضح دلیل یہ مذکورہ آیت ہے۔ معلم اسلام ﷺ فرمانے لگے کہ دیکھو میں تم لوگوں کے درمیان کوئی نیا آدمی نہیں آیا بلکہ تم لوگوں کے درمیان میں اپنی زندگی کی ایک مدت گزار چکا ہوں۔ آپ لوگ میری ساری خوبیوں اور حالات سے واقف ہیں۔ میں نے چالیس سال اپنی زندگی کے تم لوگوں کے سامنے گزارے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر تم میری باتوں پر غور و فکر کرو۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں کبھی جھوٹ بولتا ہی نہیں۔ اتنے عرصے میں میں نے کبھی انسانی معاملات میں بھی جھوٹ سے کام نہیں لیا تو میں اتنی بڑی بات جھوٹ پر مبنی کیسے کر سکتا ہوں! میں کیسے اللہ رب العزت پر بہتان باندھ سکتا ہوں! میں تم لوگوں کے سامنے صرف قول پیش نہیں کر رہا بلکہ میرے اس قول اور تعلیمات پر میری زندگی کا عملی نمونہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ یہ آپ ﷺ کی بحیثیت معلم رفعتِ شان کی ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنے عمل پر بھی دعویٰ پیش کر رہے ہیں کہ محض زبان سے تعلیم دے کر اس طرف نہیں بلا رہا مگر اس کے ساتھ ساتھ میری زندگی جو تم لوگوں کے سامنے گزری ہے کا عملی نمونہ بھی تم لوگوں کے سامنے ہے، اس کو بھی پیش کر رہا ہوں۔ اس کو بھی دیکھ لو کہ میں نے خود اس پر عمل کیا ہے اب تم لوگوں کو بھی اس طرف آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت جو خالق کائنات ہے وہ فرماتا ہے کہ اے میرے محبوب تیرے اخلاق کا درجہ بہت ہی زیادہ بلند ہے، تیرے اخلاق کی گواہی دیتا ہوں۔ فرمایا: وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَظِيْمٌ (۴) ۱۶. ترجمہ: بیشک تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

اس سے بڑھ کر معلم اسلام ﷺ کی تعلیم کے اعلیٰ معیار کی اور بھلا کیا مثال ہو سکتی ہے، جس کی تعلیم کے معیار اور اخلاق کی بلندی کے عظیم اور اعلیٰ درجے پر ہونے کا دعویٰ خود خالق کرے۔ چنانچہ فرمایا: ترجمہ: بیشک تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

کمال

ہمارے آقا ﷺ کی تعلیم کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ خود کی تعلیم پر تاثیر تھی اور دوسرے لوگوں کو بھی بہرہ مند کرتی تھی۔ معلم ﷺ خود کامل بلکہ اکمل تھا اور دوسرے ناقصوں کو بھی کمال کے درجے پر فائز کرتا تھا۔ وہ خود اخلاقی رذائل سے پاک تھا اور دوسروں

کو بھی رذائل سے پاک و صاف کر دیتا تھا۔ اس تعلیم نے شاگردوں کو ایسا کامل بنایا کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے معلم ﷺ پر لٹانا فخر اور سعادت سمجھتے تھے۔ چاہے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ ہو مگر کبھی پیچھے ہٹنے کا خیال تک نہ لائے۔ اس تعلیم کے کمال کے بارے میں خالق کافران ہے: **هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ * وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ** ¹⁷

ترجمہ: وہی ہے جس نے انہی امی لوگوں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیجا، جو ان لوگوں کے سامنے اس کی آیتوں کو پڑھ کر سنائے اور ان لوگوں کو پاکیزہ بنائے اور ان لوگوں کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے۔ جبکہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

معلم اسلام ﷺ نے اپنے شاگردوں کو اپنے اللہ رب العزت کی باتیں کھول کھول کر سنائیں اور سمجھائیں۔ اپنے شاگردوں کا خوب اچھے طریقے سے تزکیہ کیا اور ان کو پاک و صاف بنا کر پارسا بنا ڈالا۔ ان کو کتاب اللہ کی باتیں اور احکام کی تعلیم دی۔ ان کو دانائی کی باتیں سکھائیں۔ یہ معلم اسلام ﷺ کی تعلیم کا معیار تھا کہ اپنے شاگردوں کو اللہ رب العزت کی آیات، احکامات اور باتیں سناتا اور سمجھاتا تھا، ان کو اپنے فیض سے تزکیہ بھی کر لیا کرتا تھا، ناقصوں کو کامل بناتا تھا، بدکار اور گناہ گار کو نیک بناتا تھا، جو جہل کے اندھیرے میں تھے ان کو علم کی روشنی میں لے آتا تھا، جو علم سے اندھے تھے ان کو بینا کر دیا کرتا تھا، دلوں کی تاریکی بھی ختم کرنے والا تھا، دلوں کو منور کر دیتا تھا۔

معلم اسلام ﷺ نے اپنی 23 سالہ تعلیمی دور کو جب پار کر لیا تو اس وقت تک ایک لاکھ سے بھی زیادہ لوگ آپ ﷺ کی اسلامی اور روحانی تعلیم سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت جزیرہ عرب کا اخلاق پست ترین سطح پر تھا مگر جب آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا کارنامہ اختتام پذیر ہونے والا تھا تو اس وقت وہ علاقہ اخلاقیات کی اس حد تک جا پہنچا تھا جہاں تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔

درسگاہ نبوت

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی طرف نظر ڈالی جائے یا دوسرے مذاہب کے بانیوں کی تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کسی ایک فن یا علم کی تعلیم دیتے نظر آتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک یا دو علوم و فنون کی تعلیم دیتے نظر آتا ہے مگر معلم اسلام حضرت محمد ﷺ کی خود ذات مقدس کو دیکھا جائے تو وہ ایک School of thoughts اور ایک مکمل یونیورسٹی نظر آئے گی۔ جس کی بہت سی فیکلٹیز ہیں۔ ہر فیکلٹی کے کئی دپارٹمنٹ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر ڈپارٹمنٹ میں بہت سے مضامین نظر آتے ہیں۔ اس ذات مقدس کی درسگاہ سے مختلف عمر کے، مختلف اجناس کے اور مختلف اذہان کے لوگ کسب تعلیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس درسگاہ سے انسانی اخلاق کی نشوونما ہوتی رہی۔ اس درسگاہ سے شاگرد کامل بنتے رہے۔ یہ ایسے کامل بننے کے دوسروں کو بھی قابل بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

انہوں نے اپنی اس صلاحیت کو دوسروں کو کامل بنانے میں صرف بھی کیا۔ معلم اسلام ﷺ کی ذات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ ذات مقدس ایک کامل انسان، ایک کامل باپ، ایک کامل تاجر، ایک کامل آفیسر، ایک کامل معلم، ایک کامل دوست، ایک کامل شوہر، ایک کامل خانہ دار، ایک کامل منصف، ایک کامل بادشاہ، ایک کامل واعظ، ایک کامل قاضی، ایک کامل مرشد، ایک کامل رہبر، ایک کامل عابد، ایک کامل زاہد، ایک کامل صلہ رحمی کرنے والا، ایک کامل سپہ سالار، ایک کامل داماد اور ایک کامل پیغمبر کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ ایک لاکھ سے زائد لوگ اس ذات مقدس سے تعلیم پا کر کامل بنے تو کامران بھی ہوئے۔ معلم اسلام ﷺ کی درسگاہ مکہ مکرمہ میں شروع ہوئی اور اس درسگاہ میں مختلف طبقات کے لوگ زیر تعلیم رہے۔ یہ درسگاہ انسانی اخلاق کی ترقی کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ یہ درسگاہ پھر مدینہ منورہ میں منتقل ہوئی اس درسگاہ کی بناوٹ دیکھی جائے تو مٹی کی دیواریں، کھجور کے پتوں سے بنائی گئی چھت اور کھجور کے تنوں سے اس کے ستون بنائے گئے ہیں، کوئی فرش نہیں، کوئی ماربل یا ٹائل کا استعمال نہیں، کوئی پلستر یا کالر نہیں، کوئی گارڈ اور ٹی آریا کوئی آرسی کی چھت نہیں، کچا مکان ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک جھوپڑی سی ہے۔ اس درسگاہ کا نام تھا مسجد نبوی یہ وہ درسگاہ تھی جہاں پر زیر تعلیم لوگ اپنے وقت کے کامل انسان مانے گئے۔ لوگوں کی دلوں پر راج کرتے رہے۔ دشمنوں کے دلوں میں ان کا ایک دبدبہ سا تھا۔ اس درسگاہ کو دیکھتے تو ایک جماعت ان لوگوں کی نظر آتی ہے جو بڑے عقلمند اور حکیم فرمان روا مانے گئے اور اس جماعت میں ابو بکر صدیق عمر فاروق عثمان ذوالنورین اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم جیسے شاگرد شامل ہیں۔ دوسری جماعت میں صاحب تدبیر لوگ نظر آتے ہیں، جن میں طلحہ، سعد بن زبیر، سعد بن معاذ اور معاویہ رضی اللہ عنہم جیسی قدامت شخصیات و سیاستدان شاگرد کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ ہر طرف وہ لوگ شاگردوں کے روپ میں دکھتے ہیں جو بعد میں قاضی، قانوندان، زاہد، عابد اور گورنر وغیرہ بنے۔ یہ وہ جماعت تھی جس کے پاس مال و دولت کی بہت زیادہ ہی قلت تھی، حتیٰ کہ کھانے کی بھی پریشانی لاحق ہوتی تھی مگر معلم اسلام نے ان کو اخلاقی تعلیمات اور تعلیمات الہیہ سے مالا مال کر رکھا تھا۔ کبھی بھوک سے مڈھال ہوئے تو کبھی پیاس کی شدت سے تڑپ اٹھے مگر ایمان کی دولت اور اسلامی تعلیمات و اوصاف سے ہمیشہ بھرپور رہے۔ یہ وہ جماعت تھی جن کا دن روزے کی حالت میں اور کسب رزق حلال میں گذرتا اور راتیں نماز، تلاوت قرآن پاک اور ذکر و اذکار میں ہی گذرتی تھیں۔ کھانے، پینے، بکپڑے اور ہتھیاروں کی بھی سخت قلت تھی۔ ہر وقت لڑائی اور جنگ کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ کئی جنگیں لڑی بھی گئیں۔ اپنوں کو اپنے سامنے قتل ہوئے دیکھا، زخموں سے چور اپنوں کو تڑپتے ہوئے بھی دیکھا، بھوک اور پیاس کی شدت سے اپنے بچوں کو بھلتے ہوئے بھی دیکھا مگر ان شاگردوں نے دنیا کو ثابت کر کے دکھایا کہ معلم اسلام ﷺ نے ایسا درس دیا کہ سب کچھ قربان کر دیں گے، ہر تکلیف اور درد برداشت کر لیں گے مگر نبوت کے در کو چھوڑ نہیں سکتے۔ یہ وہ عظیم جماعت تیار ہوئی کہ دنیا آج بھی ان کے کردار اور اخلاق کی گرویدہ ہے۔ اس تعلیم ہی کا اثر تھا جو شاگرد اتنی سختیاں برداشت کرتے مگر کبھی اف تک نہ کرتے تھے۔ اس درسگاہ نے انمول ہیرے پیدا کیے۔ اس درسگاہ کے شاگردوں کو دیکھا

جائے تو ان میں ابوذر بھی ہے، ان میں سلمان بھی ہے اور ابوذر داء بھی ہے رضی اللہ عنہم۔ یہ خرقہ پوش شاگرد ہیں جو مسیح اسلام مانے گئے۔ کہیں اصحاب صفہ ہیں، جو جنگل سے لکڑیاں لاکر بیچتے ہیں اور اپنا گذر سفر کرتے ہیں، دن و رات در نبوت پر دوزانو ہو کر بیٹھے رہتے ہیں کہ کسب علم و فیض ہو سکے۔ حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عائشہ صدیقہ، ابن عباس، ابن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وہ شاگرد ہیں جنہوں نے تحصیل علم کیا اور محدث بنے۔ علم کی خدمت ہی میں رہے۔ علم کی اشاعت ہی اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا۔ یہ وہ درسگاہ ہے جہاں بھی نظر دوڑائیں تو کہیں غلاموں کی بھیڑ نظر آتی ہے تو کہیں آقاؤں کی محفل سچی ہوئی دکھتی ہیں، کہیں نادار اور غریب لوگ نشست سجا کر بیٹھے ہیں تو کہیں مالدار اور دو لہند اپنی مجلس لگا کر بیٹھے ہیں سب کے طبقات تو الگ تھے مگر اس درسگاہ سے جڑنے کے بعد ان سب کی ظاہری عزت اور اعزاز بالکل یکساں رہا۔ کوئی غلام اور آقا کی تمیز نہ تھی۔ بڑے اور چھوٹے کافر نہ رہا۔ عرب و عجم کا اکرام نہ رہا۔ سب کے سب مساوات میں برابر رہے۔ سب کے سب صداقت کی شمع کے پروانے تھے، ایک ہی شمع کے گرد چکر لگاتے رہے۔ سب کے سینے توحید کی تعلیم سے منور تھے۔ سب کے سب خود کو اللہ رب العزت کا ہی غلام مانتے تھے۔ نبوت کے جان نثار تھے۔ بس ان میں عزت و اعزاز کی تفریق تھی تو وہ بھی صرف اور صرف تقویٰ اور زہد کی بنا پر تھی ورنہ اس درسگاہ میں سب مساوات کی ایک ہی سطح پر تھے۔

نتائج

- 1۔ معلم اسلام ﷺ کی تعلیمات نے بندے کو اپنے رب سے جوڑ دیا۔ اس تعلیمات کی بدولت اپنے رب کا فرمانبردار اور پیارا بنا۔
- 2۔ معلم اسلام ﷺ کی زندگی اور کردار دنیا کے معلموں اور فلاسفوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ان کے طرز پر تعلیم دینے سے بہت بڑی کامیابی اور منزل مقصود تک پہنچا جاسکتا ہے۔

- 3۔ معلم اسلام ﷺ کی تعلیمات اور کردار کو سامنے رکھ کر انسان دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

تجاویز

- 1۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی، کردار اور تعلیمات کو عملی نقطہ نظر سے علمی انداز میں پیش کیا جائے اور مبالغوں سے بچنے کی کوشش کی جائے تاکہ اپنوں کے ساتھ غیر بھی ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کی صداقت کو سمجھ سکیں۔ ایسا کرنے سے ان کو یہ بات کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ سب کچھ محض ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر محض تعریفات ہی لکھی اور محفوظ کی گئی ہیں۔

- 2۔ اس امت کے اہل علم حضرات نے سیرت رسول ﷺ پر بہت زیادہ تصانیف کی ہیں۔ ان میں سے اکثر تصانیف تقدس کے جذبے کے تحت تصنیف کی گئی ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ انسانیت کی رہنمائی، ہدایت اور کامیابی کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔ انسانیت کے سب

سے بڑے خیر خواہ تھے۔ ان کی سیرت پر نبوت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر تصانیف کی جائیں تاکہ وہ امت کے لئے علمی اور فکری ترقی کا ذریعہ بن سکیں۔

3۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت اور مشن کو بھی علمی انداز میں پیش کیا جائے تاکہ نبی کریم ﷺ تمام انسانوں کے لئے رحمت اللعالمین کا سبب بن سکیں۔

¹ . عرفان احمد، سید، انسائیکلو پیڈیا سیرت النبی ﷺ، ص 29، زمزم پبلشرز، کراچی 2005۔

² . محمد طیب، قاری، مولانا، آفتاب نبوت، طبع اول، ص 102، ادارہ اسلامیات، لاہور 1980۔

³ . بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب تفسیر، سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ، حدیث نمبر 3116۔

⁴ . عثمانی، شفیع محمد، مفتی، آداب النبی ﷺ، ص 13، ادارہ اسلامیات، لاہور

⁵ . خطیب تبریزی، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح، جلد سوئم، باب صحابہ کرام کے مناقب کا بیان، حدیث نمبر 6018۔

⁶ . مظاہری، محمد عبدالرحمن، مولانا، سیرت التابعین، ص 5، ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں، دہلی انڈیا 1398ھ۔

⁷ . محمد رابع حسنی، مولانا، رہبر انسانیت ﷺ، ص 38، دار الرشید، لکھنؤ 2008۔

⁸ . جوامع السیرت ﷺ، اشاعت دوم، ص 506، حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی 2009۔

⁹ . اختر امام عادل، قاسمی، مولانا، مقام محمود (انتیاز سیرت طیبہ)، ص 378، مفتی ظہیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منور اشرف، سم س تی پور، بہار انڈیا 2015۔

¹⁰ . سورۃ البیونس 10، آیت 16۔

¹¹ . سورۃ البقرۃ 2، آیت 44۔

¹² . سورۃ الصف 61، آیت 2، 3۔

¹³ . ابو داؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، جلد دوم، باب تہجد میں بلند آواز سے قرأت کا بیان، حدیث نمبر 1342۔

¹⁴ . سورۃ الیونس 10، آیت 16۔

¹⁵ . خلیق احمد، مفتی، سیرت النبی ﷺ، طبع اول، ص 70، عجمان، متحدہ عرب امارات 2014۔

¹⁶ . سورۃ القلم 68، آیت 4۔

¹⁷ . سورۃ الجمعۃ 62، آیت 2۔

ASALEEB UL IMAM AL-DARUQUTNI FE TA'LEEL IL AHADITH MIN KHILAL KITABIHI AL-GHRAIB WAL AFRAD (CRITICAL ANALYSIS)

أساليب الإمام الدارقطني في تحليل الأحاديث من خلال كتابه الغرائب والأفراد (دراسة نقدية)

محمد نعيم مسلم باحث الدكتوراه في قسم الحديث الشريف وعلومه بالجامعة الإسلامية بإسلام آباد

أ.د. فتح الرحمن القرشي رئيس قسم الحديث الشريف وعلومه بالجامعة الإسلامية بإسلام آباد

ABSTRACT: The methodology of Imam Al Daraqutni in the analysis of the sunnah in the book of "al Gharaib wal Afraad" Al-tafarrud¹ is one of the subtle, deep and the most problematic field of "ilm al ilal"². And the book: "al- Gharaib wal-Afraad" by Imam Al-Daraqutni is considered one of the most important sources of this delicate science. Due to the significance of this work, the department of Hadith at the International Islamic University has decided to make this great heritage a research project for doctoral theses, which deals with a critical study of the ahadith that Imam Al-Daraqutni declared malulah (defective) in "al- Gharaib wal-Afraad" in fact, Imam Al-Daraqutni has authorship this book into 100 parts but a few parts are found and most of it is lost. And these components have been ordered by Imam ibn Qaisarani but utilizing from works of Qaisarani is not unmistakable.

KEYWORDS: defective, Al-tafarrud, Gharaib, ilm-ul-ilal, Asaleeb-ul-Imam Al-Daraqutni, Ta'leel-ul-Hadith,

التمهيد: إن الحمد لله تعالى نحمده ونستغفره ونعوذ بالله من شرور أنفسنا وسيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضل فلا هادي له وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله. أما بعد! لقد أمرنا الله تعالى باتباع رسوله دون مرء وطاعته دون جدال، فالكتاب والسنة هما الشرع الحنيف القيم من تمسك بهما رشد ومن حكم بهما عدل ومن عمل بهما أجر ومن التزم بهما هُدي إلى صراط مستقيم. في الحقيقة أن علوم الحديث وقواعدها التي قَعَدَها الأئمة لمعرفة صحيح حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم وضعفه تدل على توفيق الله لهم على ما وهبهم من القوة والفتنة، وفي كل عَصْرٍ تحمّل علماء السنة مسؤوليتهم، فحملوا السنة، وألّفوا فيها تأليف، وحرروا المسائل، وترجموا لآلاف الرواة، وإن من هؤلاء الأئمة الحفاظ الإمام الدارقطني فقد دون في هذا الفن كتباً كثيرة في شتى أنواعها من العلل والرجال والأفراد والغرائب، وكان منها كتابه الضخم الحافل الجامع لأنواع الأفراد والغرائب وموسوعة شاملة لرواة الحديث من الثقات والضعفاء والمجهولين والكذابين المسمى بـ — الأفراد والغرائب.

1 :Al-tafarrud means that the narrator is alone in narrating a hadith

2 :Ilm ul ilal is a branch of hadith's sciences which deals with the hidden detrimental flaw.

وإن كتاب الأفراد والغرائب للإمام الدارقطني، بحيث إن هذا الكتاب يفتح باباً واسعاً في دقيق من تخصصات علم الحديث وهي معرفة الأفراد والغرائب وفي الحقيقة أن هذا الكتاب يكون أما في هذا المجال، وإنّ مثل هذه المصنّفات نماذج لأحاديث كثيرة، رويت بأسانيد مختلفة للدلالة على الغرابة أو التّفرد الذي لحق بها، ومتى ما انفرد الراوي وحّدث بما يخالف الثقات، أو انفرد بما لا يتابع عليه من الثقات؛ فإنّه يجب حينئذ النظر والتدقيق والبحث فيما رواه مقارناً بروايات الثقات.

فالتّفرد والمخالفة عاملان من عوامل إدراك العلة في الحديث، وكلمة التّفرد يدخل في إطارها العام من أنواع علوم الحديث، وأنّ التعليل في كتب العلل يدور على الخطأ والوهم والغلط سواء كان في تعليل المسند بالمرسل أم العكس، أم تعليل الرفع بالوقف أم ضده، أم بعدم سماع الراوي من فوقه، أم التعليل بالزيادة أم بالنقص، أم بغيره ومن هنا تأتي العلة ومدى تأثيرها في الحديث والحكم عليه، وسأتناول بعد هذه المقدمة بالنقاط التالية:

أولاً: التعريف بكتاب الأفراد والغرائب.

ثانياً: الإشكالات التي تكون في كتاب أطراف الأفراد والغرائب.

ثالثاً: نماذج من الأحاديث التي أعلها الإمام الدارقطني في كتابه الأفراد.

رابعاً: الخاتمة والنتائج.

أولاً: التعريف بكتاب "الأفراد والغرائب"

من خلال كتب الحديث أحياناً نجد عن العلماء شيئاً من الاختلاف في تسمية كتاب الإمام الدارقطني وسأذكر من كل تسمية ثلاثة قول في ذلك كما ستأتي:

القول الأول: من ذكر كتابه بالغرائب:

1 : الإمام إسماعيل باشا في كتابه هدية العارفين.¹

2 : الإمام صديق حسن خان في كتابه التاج المكلل.²

3 : الإمام ابن الخلكان في كتابه وفيات الأعيان.³

القول الثاني: من ذكر كتابه بالأفراد:

1 : الإمام ابن كثير في كتابه اختصار علوم الحديث.⁴

2 : الإمام ابن حجر في كتابه لسان الميزان ذكره في عشرين موضعاً.⁵

3 : ابن عراق في كتابه تزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة ذكره في تسعة عشر موضعاً.⁶

القول الثالث: من ذكر كتابه بالأفراد والغرائب:

1 : الإمام إسماعيل باشا في كتابه هدية العارفين.⁷

2 : الإمام ابن خير في فهرسته.⁸

3 : الإمام الذهبي في كتابه المنتقى من منهاج الاعتدال في نقض كلام أهل الرفض والاعتزال.⁹

القول الرابع: من ذكر كتابه بالفوائد الأفراد:

1 : الدكتور فؤاد سزكين في كتابه تاريخ التراث العربي.¹⁰

2 : الإمام أبو القاسم المهرواني في الفوائد المنتخبة الصحاح والغرائب.¹¹

3 : خزانة التراث فهرس لمخطوطات قام بإصداره مركز الملك فيصل.¹²

القول الرابع: الراجح:

لا شك أن كل إمام بالاسم الذي ذكره وأطلق عليه، هو مصداق حقيقي له، لأنه الذي يتضمنه ويجويه، وفي الحقيقة أن الكتاب يشتمل الغرائب والأفراد كليهما، ولأجل هذا اشتهر بهذا الاسم، ولا مانع من الجمع بينهما في تسمية الكتاب بالأفراد والغرائب، ولا سيما أنه ورد بهذا الاسم عن بعض الأئمة كما ذكر العلامة ابن خير في فهرسه وهو يقول: كتاب الأفراد والغرائب من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم تأليف أبي الحسن الدارقطني في مائة جز.¹³

إذن! فالاسم الذي أختاره هو الأفراد والغرائب، وبناء عليه فاسم كتاب ابن القيسراني يكون أطراف الأفراد والغرائب للإمام الدارقطني. والله أعلم!

ثانيا: الإشكالات التي تكون في كتاب الأطراف:

وفي الحقيقة أن الإمام الدارقطني جمع موسوعة ضخمة في أحاديث وآثار الغرائب والأفراد في مائة جزء ولكن بعض أجزاء موجودة وبعضها مفقودة، بحيث أن المطبوع منها خمسة أجزاء: الثاني والثالث والرابع والسادس والثالث والثمانون وقد طُبعت هذه الأجزاء كلها ولكن الوصول إلى الحديث كان من الصعب والعسير لأنه لم يرتب الأحاديث على ترتيب، وكان من أمالي أئمة الحديث أن لو قام أحد بترتيب هذا الكتاب، فلما سمع الإمام ابن القيسراني جزم على ترتيبه، فرتبه على ترتيب المسانيد بعد أن حذف أسانيده، وذكر طرف الحديث فقط ثم ذكر تعليق الإمام الدارقطني عقب الحديث مراعيًا بالحروف المعجم في أصحاب المسانيد فجعله في خمسة فصول وهي:

الفصل الأول منها: في مسانيد العشرة المبشرين بالجنة رضوان الله عليهم.

والفصل الثاني: في مسانيد أصحاب الأسماء من الصحابة رضوان الله عليهم.

والفصل الثالث: في أصحاب الكني منهم رضوان الله عليهم.

والفصل الرابع: في مسانيد النساء الصحابييات رضوان الله عليهن وابتدأها بصاحبات الأسماء ثم الكني.

والفصل الخامس: في المراسيل والمبهمين ورتب الفصول الأربعة الأخيرة بحسب حروف المعجم مراعيًا الحرف الأول فقط وقسم مرويات المكثرين بحسب من روى عنهم ورتب هؤلاء الرواة على حروف المعجم مراعيًا الحرف الأول. أما الإشكال الأول: هل التزم الإمام ابن القيسراني في الأطراف بالترتيب الذي ادعى؟ وفي الواقع أنه لم يلتزم بما قال، ولكنه راعى في ترتيب مسانيد بوجه عام، وأوضح ما أقول بالأمثلة الآتية لاتضح الصورة وهي:

فمثلاً في ترتيب مسانيد مَن الذي اسمه بدأ بحرف الألف من الصحابة، بحيث لم يراع الترتيب في الحرف يلي الألف، هكذا: مسند أسامة بن زيد ثم مسند أسامة بن شريك ثم مسند أبي بن كعب ثم مسند الأسود بن سريع ثم مسند الأسود بن خلف ثم مسند الأحمر بن جزء ثم مسند أمية بن مخشي ثم مسند الأرقم بن أبي الأرقم وغيرها، هذا بالنسبة لأصحاب المسانيد وكذلك فعل بالنسبة لمن يروي عنهم لم يراع ترتيب حروف المعجم أيضاً مثلاً: سعيد بن المسيب عن علي ثم سعيد بن القيس عن علي ثم سعيد بن حيان عن علي ثم سويد بن غفلة عن علي ثم سليمان بن صرد عن علي ثم شريح بن هانئ عن علي ثم شتير بن شكل عن علي وغيرها، ولا شك أن هذا الترتيب مخل ولكنه في الأعم الأغلب مقبول وخاصة كان أصل الكتاب غير مرتب وكانت أحاديثه متناثرة ولكنني وجدت بالمقارنة بين كتاب الأطراف للإمام ابن القيسراني والأفراد والغرائب للإمام الدارقطني بأن ابن القيسراني لم يلتزم بأقوال الإمام الدارقطني في تعقباته على الأحاديث بل تصرف فيه حسب اجتهاداته وفهمه، بل أحياناً لا يذكر طرف الحديث وإنما يشير بموضوعه فقط، فمثلاً حديث الوتر، كما أخرجه الإمام الدارقطني بروايتين في موضعين: فقال في الأولى: رواه قتادة عن عذرة عن سعيد بن عبد الرحمن بن أبزى عن أبي بن كعب، وقال: تفرد به المسيب بن واضح عن عيسى عن ابن أبي عروبة عن قتادة.

وقال في الثانية: هذا حديث غريب من حديث فطر بن خليفة عن زبيد عن سعيد عن أبي، وتفرد به عيسى وذكر فيه القنوت قبل الركوع وأتى به بتمامه، ولكن الإمام ابن القيسراني جمع الروايتين في مكان واحد ثم عنون بهما بعنوان الوتر، وأضاف إليهما روايات أخرى ثم علق عليهما.

وأما الإشكال الثاني وهو حذف الأسانيد:

كما ذكرت سابقاً أن الحافظ ابن طاهر المقدسي قد قام بترتيب أطراف هذا الكتاب على المسانيد وحذف أسانيد الدارقطني فحفظ لنا كلام الدارقطني على الأحاديث وحرماناً من الأسانيد، ونيتة كان خيراً كما هو يقول بنفسه في مقدمة كتابه: وتختصر على إيراد أطراف ما ذكر أبو الحسن في فوائده لأننا قصدنا ترتيبه. وأما الغريب والأفراد في الحديث فأضعاف هذا وليس قصدنا استقصاء هذا النوع ورتبناه على الأطراف مختصراً للفائدة لأننا لو أوردناه بأسانيد ومثونه لطال الكتاب ولم ينتفع به إلا من كان مسموعاً له.¹⁴

وكما هو معلوم أن غالب أسباب العلل تتعلق بالأسانيد وإذا لم تكن الأسانيد فكيف تناقش علة الحديث؟ في حين أن الأفراد والغرائب لا توجد إلا في بعض كتب السنة، ولأجل هذا أصابني مشقة في البحث عن الأسانيد المحذوفة بل أحيانا بعد ثلاثة أيام ما وجدت الحديث بالسند الذي أشار إليه الإمام الدارقطني، فإليت أن الإمام ابن القيسراني ما فعل هذا.

والجدير بالذكر أن ممن رتب الأفراد والغرائب أيضاً الحافظ علي بن أبي بكر الهيثمي في كتابه جمع أحاديث الغيلانيات والخلعيات وفوائد تمام وأفراد الدارقطني.

ويقول الباحث محمد بن عبد الله السريّ: ولم يكن مكان وجود كتاب الهيثمي معروفاً إلى وقت قريب، حتى وقّف على نسخته الخطية في مكتبة الشيخ أحمد البساطي، بالمدينة المنورة، ثم من الله عليّ، فصورتها كاملة بتعاون كريم من الأفاضل الأماجد في دارة الملك عبدالعزيز، ونظارة مكتبة البساطي.

وبعد جرد الكتاب واستقراءه تأمناً، تجلّى بوضوح أن الإمام الهيثمي رتب فيه الأجزاء العشرة الأولى من كتاب الأفراد ولم يورد فيه من غيرها شيئاً وهذا وإن كان بخلاف ما كان مأمولاً من حفظ الأفراد بتمامه إلا أنه لم يكن مستبعداً بالنظر إلى حجم الكتاب وكونه مضموماً إلى ثلاثة كتب أخرى في كتاب واحد فكتاب الإمام الهيثمي يقدم ستة أجزاء جديدة من الأفراد لم تنشر من قبل على وجهها وهي الأجزاء: الأول والخامس والسابع والثامن والتاسع والعاشر ولكن المطبوع: خمسة أجزاء: الثاني والثالث والرابع والسادس والثالث والثمانون وقد طُبعت هذه الأجزاء كلها.

أقول: إن الباحث في هذه الأجزاء (الأول والخامس والسابع والثامن والتاسع والعاشر) من الأفراد للإمام الدارقطني بترتيب الحافظ الهيثمي في كتابه: (جمع أحاديث الغيلانيات والخلعيات وأفراد الدارقطني) يكون محمد بن عبد الله السريّ ومشرفه على الرسالة يكون فضيلة أ.د. حسين العبدلي أستاذ قسم فقه السنة، ولكنه حتى الآن ما ناقش رسالته الدكتوراه.

وفي الحقيقة أنني بذلت جهدي تمام الجهد وبخنت عن المخطوط من طريق أصدقائي وأساتذتي- في السعودية ومصر والكويت وتركيا وسند باكستان- لحصول هذا المخطوط ولكن مع الأسف الشديد حتى ما وفقت له، وتكلمت مع الباحث محمد عبد الله الاسريع وهو وعدني أن يرسل لي رسالته المطبوعة إن شاء الله.

ثالثاً: نماذج من المرويات المعلولة

لا شك إن الإمام الدارقطني له معرفة جيدة وإطلاع واسع على العلل وكتابه العلل من أكبر المصنفات في علم نقد الأخبار والآثار وقد وضع فيه خلاصة علمه وأبان العلل بأسلوب يجلي العلة ويبرزها كما أنه أعل الحديث وبين صوابه في كتابه الغرائب والأفراد بالاختلاف والتفرد من قبيل تعارض الرفع والوقف وتعارض الوصل والإرسال

والاختلاف بزيادة راو في السند وإسقاطه من السند والاختلاف في المتن إدراجا وتغييرا وغيرها من أسباب العلل وسأذكر في الصفحات الآتية نماذج من الاختلاف والتفرد كما تلي:

النموذج الأول: الرواية المعلولة بالاختلاف في تسمية الشيخ

مسند سعد رواية عامر بن سعد عن أبيه سعد بن أبي وقاص

(27) 500 : حديث (لما حكم سعد¹⁵ في بني قريظة...) الحديث

قول الإمام الدارقطني:

قال الإمام الدارقطني: تفرد به مُحَمَّد بن صالح التمار¹⁶ عَنْ سعد بن إبراهيم¹⁷ عَنْ عامر¹⁸،

وَرَوَاهُ شُعْبَةُ¹⁹ عَنْ سعد بن إبراهيم عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بن سهل²⁰ عَنْ أَبِي سعيد²¹.²²

أولاً: تخريج الحديث من طريق عامر عن أبيه سعد:

1 : أخرجه الإمام النسائي في السنن الكبرى من طريق محمد بن عبد الله بن المبارك، قال: حدثنا أبو عامر، عن

محمد بن صالح، عن سعد بن إبراهيم، عن عامر بن سعد، عن أبيه. بمثله.²³

2 : وأخرجه أيضا في كتابه فضائل الصحابة من نفس الطريق به. بمثله.²⁴

3 : وأخرجه الإمام الحاكم في مستدركه من طريق أبي جعفر أحمد بن عبيد ثنا إبراهيم بن الحسين ثنا إسحاق بن

محمد وإسماعيل بن أبي أويس، قالوا: ثنا محمد بن صالح التمار به. بمثله.²⁵

4 : وأخرجه الإمام البزار في مسنده من محمد بن المثنى، قال: نا أبو عامر عبد الملك بن عمرو، قال: نا محمد بن

صالح التمار به. بمثله.²⁶

5 : وأخرجه الإمام أبو عبد الله المقدسي في المستخرج بسنده من طريق عبد الوهاب بن علي بن علي أن عبد الأول

بن عيسى السجزي أنا عبد الرحمن بن محمد بن المظفر أنا عبد الله بن أحمد السرخسي أنا إبراهيم بن خزيمة الشاشي

نا أبو محمد عبد بن حميد ثني خالد بن مخلد ثني محمد بن صالح التمار به. بمثله.²⁷

6 : وأخرجه الإمام الحميدي في مسنده من طريق خالد بن مخلد، حدثني محمد بن صالح التمار به. بمثله.²⁸

7 : وأخرجه الإمام البيهقي في سننه الكبرى من طريق أبي عبد الله الحافظ أنا أبو جعفر أحمد بن عبيد أنا إبراهيم بن

الحسين نا إسحاق بن محمد وإسماعيل بن أبي أويس قالوا: ثنا محمد بن صالح التمار به. بمثله.²⁹

8 : وأخرجه الإمام البيهقي في كتابه الأسماء والصفات من نفس الطريق. بمثله.³⁰

9 : وأخرجه الإمام الطحاوي في شرح معاني الآثار من طريق إبراهيم بن مرزوق ثنا أبو عامر العقدي ثنا محمد بن

صالح التمار به. بمثله.³¹

- 10 : وأخرجه أيضا في شرح مشكل الآثار من طريق أبي أمية ثنا يعقوب بن محمد ثنا صالح بن محمد ومعن بن عيسى وعبد العزيز بن عمران عن محمد بن صالح به بمثله.³²
- ثانيا: تخريج الحديث من طريق أبي أمامة عن أبي سعيد الخدري:
- 1 : أخرجه الإمام البخاري بسنده في صحيحه من طريق سليمان بن حرب، حدثنا شعبة، عن سعد بن إبراهيم، عن أبي أمامة هو ابن سهل بن حنيف، عن أبي سعيد الخدري بمثله.³³
- 2 : وأخرجه الإمام مسلم في صحيحه من طريق أبي بكر بن أبي شيبة، ومحمد بن المثنى، وابن بشار، وألفاظهم متقاربة، قال أبو بكر: نا غندر عن شعبة، وقال الآخرون: نا محمد بن جعفر، نا شعبة به بمثله.³⁴
- 3 : وأخرجه الإمام النسائي في السنن الكبرى من طريق إسماعيل بن مسعود نا خالد، عن شعبة به بمثله.³⁵
- 4 : وأخرجه أبو داود في سننه من طريق حفص بن عمر، حدثنا شعبة، به بمثله.³⁶
- 5 : وأخرجه الإمام أحمد في مسنده بسنده من طريق عفان، حدثنا شعبة به بمثله.³⁷
- 6 : وأخرجه أبو عوانة في مستخرجه من طريق يوسف بن مسلم نا حجاج بن محمد نا شعبة به بمثله.³⁸
- 7 : وأخرجه الإمام ابن حبان في صحيحه من طريق أحمد بن علي بن المثنى نا أبو خيثمة ثنا عبد الرحمن بن مهدي، عن شعبة، به بمثله.³⁹
- 8 : وأخرجه الإمام البخاري في كتابه الأدب المفرد من طريق محمد بن عرعة حدثنا شعبة، به بمثله.⁴⁰
- 9 : وأخرجه أيضا في كتابه فضائل الصحابة من طريق عمرو بن علي عن محمد قال أنا شعبة به بمثله.⁴¹
- 10 : وأخرجه الإمام أبو يعلى الموصلي في مسنده من طريق زهير نا ابن مهدي عن شعبة به بمثله.⁴²
- 11 : وأخرجه الإمام أبو محمد في مسنده بسنده من طريق سليمان بن حرب، ثنا شعبة، به بمثله.⁴³
- 12 : وأخرجه الإمام البيهقي في سننه الكبرى من طريق أبي الحسن علي بن أحمد بن عبدان أنبا أحمد بن عبيد ثنا أبو مسلم ثنا سليمان بن حرب ثنا شعبة به بمثله.⁴⁴
- 13 : وأخرجه أيضا في شعب الإيمان من طريق أبي عبد الله الحافظ أنبا أبو النضر نا محمد بن أيوب أنبا أبو الوليد نا شعبة به بمثله.⁴⁵
- 14 : وأخرجه أيضا في الآداب من طريق أبي عبد الله الحافظ نا أبو بكر بن بالويه نا أبو مسلم نا سليمان بن حرب نا شعبة به بمثله.⁴⁶
- 15 : وأخرجه الإمام البغوي في شرح السنة من طريق عبد الواحد بن أحمد المليحي، أنا أحمد بن عبد الله النعيمي، أنا محمد بن يوسف، نا محمد بن إسماعيل، نا سليمان بن حرب، نا شعبة، به بمثله.⁴⁷
- 16 : وأخرجه الإمام الإصبهاني بسنده من طريق فاروق بن عبد الكبير ثنا أبو مسلم الكشي ثنا سليمان بن حرب ثنا شعبة به بمثله.⁴⁸

- 17 : وأخرجه الإمام ابن أبي شيبة في مصنفه من طريق غندر عن شعبة به بمثله.⁴⁹
- 18 : وأخرجه الإمام سعيد بن منصور بسنده في سننه من طريق عبد الرحمن بن زياد، نا شعبة، به بمثله.⁵⁰
- 19 : وأخرجه الإمام ابن زنجويه بسنده في كتابه الأموال من طريق النفيلي أنا مسكين، ثنا شعبة به بمثله.⁵¹
- 20 : وأخرجه الإمام الخطيب البغدادي في الجامع لأخلاق الراوي من طريق أبي العلاء محمد بن الحسن بن محمد الوراق، أنا أبو بكر أحمد بن كامل نا أبو قلابه الرقاشي نا بشر بن عمر نا شعبة به بمثله.⁵²
- سند الحديث ومثله:**

بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجا للحديث بالسندين الذين ذكرهما الإمام الدارقطني في كتبه الخاصة ولكنه أخرجه الإمام النسائي في السنن الكبرى من طريق محمد بن عبد الله بن المبارك، قال: حدثنا أبو عامر، عن محمد بن صالح، عن سعد بن إبراهيم، عن عامر بن سعد عن عامر بن سعد عن أبيه أن سعدا حكم على بني قريظة أن يقتل منهم كل من جرت عليه موسى وأن تسي ذرايرهم وأن تقسم أموالهم فذكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم فقال: «حكمت فيهم بحكم الله الذي حكم به فوق سبع سموات»

دراسة علة الحديث:

في الحقيقة أن الإمام الدارقطني أشار إلى طريقين وهما:

الطريق الأولى: طريق محمد بن صالح التمار عن سعد بن إبراهيم عن عامر عن سعد رضي الله عنه. قلت: وهذه الطريق من حيث الإسناد ضعيف لأن فيه محمد بن صالح وهو وإن كان صدوقا ولكنه يخطئ. وأما الطريق الثانية: طريق شعبة عن سعد بن إبراهيم عن أبي أمامة بن سهل عن أبي سعيد رضي الله عنه. قلت: وهذه الطريق من حيث الإسناد صحيح لأن رجاله ثقات. أقول: وقد اختلف في الإسناد على سعد بن إبراهيم وهو مدار السند حيث قال شعبة عن سعد بن إبراهيم عن أبي أمامة بن سهل عن أبي سعيد رضي الله عنه ولكن خالفه محمد بن صالح التمار إذ قال عنه عن عامر بن سعد عن أبيه سعد رضي الله عنه.

وأما مدار السند وهو سعد بن إبراهيم بحيث روى عنه محمد بن صالح التمار وشعبة :

ذكره الإمام ابن حبان في الثقات.⁵³

وذكر الإمام ابن أبي حاتم في كتابه الجرح والتعديل قول صالح بن أحمد بن محمد بن حنبل: قال أبي: سعد بن إبراهيم ثقة ولي قضاء المدينة وكان فاضلاً وكان الزهري يقول: سعد سعد.⁵⁴

قال الإمام ابن سعد: كان ثقة كثير الحديث.⁵⁵

وقال الإمام العجلي: سعد بن إبراهيم لا بأس به وكان على قضاء واسط وقال أيضا مدني ثقة.⁵⁶

روى عنه محمد بن صالح التمار:

قال ابن أبي حاتم: سألت أبي عن محمد بن صالح التمار فقال: شيخ ليس بالقوي ولا يعجبني حديثه.⁵⁷
 ترجم له الإمام البخاري في التاريخ وذكر له حديثه هذا مستنكرا إياه عليه ومخالفة شعبة له وكأنه ضعفه.⁵⁸
 محمد بن صالح التمار عن الزهري، وعنه خالد بن نزار ليس بالقوي قاله الدارقطني.⁵⁹
 وذكره الإمام ابن حبان في الثقات.⁶⁰ وقال الإمام العجلي: محمد بن صالح التمار، مدني، ثقة.⁶¹
 وروى عنه أيضا شعبة:
 قال الإمام ابن أبي حاتم: كان سفيان الثوري يقول: شعبة أمير المؤمنين في الحديث.⁶²
 وقال الإمام العجلي: ثقة، تقي.⁶³ وقال الإمام ابن سعد: كان ثقة مأمونا ثبتا صاحب حديث حجة.⁶⁴
 وأما عند الترجيح فأولى هذه الروايات بالتقدم هي الأولى وعليها اعتمد الشيخان لإخراجها في صحيحيهما ولأن
 محمد بن صالح ضعيف ومخالفته لا محل لها، كما ذكر الإمام الدارقطني وهو يقول في علله: حدث به سعد بن
 إبراهيم واختلف عنه؛ فرواه محمد بن صالح التمار عن سعد بن إبراهيم عن عامر عن سعد.
 وخالفه عياض بن عبد الرحمن، فرواه عن سعد بن إبراهيم، عن أبيه، عن جده عبد الرحمن بن عوف.
 وكلاهما وهم، وخالفهما شعبة فرواه عن سعد عن أبي أمامة عن أبي سعيد الخدري، وهو الصواب.⁶⁵
رأي الباحث:

- 1 : بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجا للحديث بالسندين الذين ذكرهما الدارقطني في كتبه الخاصة.
- 2 : علل الإمام الدارقطني هذا السند بالتفرد فتعليله صحيح لأنه ما روى هذا الحديث إلا محمد بن صالح التمار عن سعد بن إبراهيم عن عامر بن سعد عن سعد رضي الله عنه.
- 3 : إن الطريق الأولى ضعيف لأن في سندها يكون محمد بن صالح وهو وإن كان صدوقا، لكنه يخطئ.
- 4 : محل الخلاف ومدار السند يكون سعد بن إبراهيم وهو من الثقات.
- 5 : العلة الأصلية في الحديث هي الاختلاف في تسمية الشيخ كما يكون سعد بن إبراهيم مدار السند حيث روى عنه محمد بن صالح التمار عن سعد بن إبراهيم عن عامر بن سعد عن سعد رضي الله عنه، وروى عنه أيضا شعبة عن سعد بن إبراهيم عن أبي أمامة بن سهل عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه.
- 6 : ولا ريب في تقديم رواية شعبة، لأنه من أئمة أهل الحديث، وأن هذه أخرجها الأئمة في صحاحهم في حال أن محمد بن صالح التمار وإن كان صدوقا، لكنه يخطئ.

النموذج الثاني: الرواية التي ذكر فيها التفرد وهو محتمل لكونه من الثقات

مسند سعد رواية عامر بن سعد عن أبيه سعد بن أبي وقاص
 (272) 504 : حديث (جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَيَّ النَّبِيُّ فَقَالَ: إِنْ أَبِي كَانَ يَصِلُ الرَّحِمَ...) الحديث

قول الإمام الدارقطني:

قال الإمام الدارقطني: تفرد به إبراهيم بن سعد⁶⁶ عن الزُّهري⁶⁷ عنه⁶⁸.⁶⁹

تخريج الحديث:

- 1 : أخرجه الإمام الطبراني بسنده في المعجم الكبير من طريق علي بن عبد العزيز، ثنا محمد بن أبي نعيم الواسطي، ثنا إبراهيم بن سعد، عن الزهري، عن عامر بن سعد، عن أبيه بمثله.⁷⁰
- 2 : وأخرجه الإمام أبو عبد الله المقدسي في المستخرج بسنده من طريق أبي بكر محمد بن أبي عبد الله أنا أبو الحسن سعد الخير بن محمد بن سهل الأنصاري أنا أبو محمد عبد الرحمن بن حمد الدواني أنا أبو نصر أحمد بن الحسين أنا أبو بكر أحمد بن محمد بن إسحاق السبي أنا محمد بن صاعد والقاضي أبو عبيد علي بن الحسين قالنا نا زيد بن أحمز نا يزيد بن هارون نا إبراهيم بن سعد به بمثله.⁷¹
- 3 : وأخرجه الإمام ابن السني في عمل اليوم والليلة من طريق أبي محمد بن صاعد والقاضي أبي عبيد علي بن الحسين قالنا: ثنا زيد بن أحمز نا يزيد بن هارون نا إبراهيم بن سعد به بمثله.⁷²
- 4 : وأخرجه الإمام البيهقي في دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة من طريق أبي محمد عبد الله بن عبد الرحمن أنا أبو بكر محمد بن الحسن بن يعقوب نا موسى بن الحسن النسوي نا أبو نعيم الفضل بن دكين، نا إبراهيم بن سعد، به بمثله.⁷³
- 5 : وأخرجه الإمام الإصبهاني في كتابه معرفة الصحابة من طريق سليمان بن أحمد، نا علي بن عبد العزيز، نا محمد بن أبي نعيم، نا إبراهيم بن سعد، به، بمثله.⁷⁴
- 6 : وأخرجه الإمام أبو بكر قاضي المارستان في كتاب أحاديث الشيوخ الثقات المشيخة الكبرى من طريق أبي بكر بن حمدويه نا أبو عبد الله الحسين بن الحسن نا أبو عمرو عثمان بن أحمد نا أبو علي حنبل بن إسحاق بن حنبل حدثنا محمد بن أبي نعيم قال حدثنا إبراهيم بن سعد به بمثله.⁷⁵
- 7 : وأخرجه الإمام المقدسي في التوحيد لله عز وجل من طريق عبد الرزاق بن إسماعيل، والمطهر بن عبد الكريم، أنا أبو محمد عبد الرحمن بن حمد الدوني، أنا أبو نصر أحمد بن الحسين بن محمد الدينوري، أنا أبو بكر أحمد بن محمد بن السني، أنا أبو محمد بن صاعد، والقاضي أبو عبيد علي بن الحسن بن حرب، قالنا: ثنا زيد بن أحمز، نا إبراهيم بن سعد، به بمثله.⁷⁶

سند الحديث ومتمته:

بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجا للحديث بالسند الذي ذكره الإمام الدارقطني في كتبه الخاصة ولكنه أخرجه الإمام الطبراني بسنده في المعجم الكبير من طريق علي بن عبد العزيز، ثنا محمد بن أبي نعيم، ثنا إبراهيم بن سعد، عن الزهري، عن عامر بن سعد عن سعد قال: جاء أعرابي إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: إن أبي كان يصل

الرحم وكان وكان فأين هو؟ قال: «في النار»، قال: فكأن الأعرابي وجد من ذلك، فقال: يا رسول الله، فأين أبوك؟ فقال: «حيثما مررت بقبر كافر فبشره بالنار» فأسلم الأعرابي بعد ذلك فقال: لقد كلفني رسول الله صلى الله عليه وسلم تعباً، ما مررت بقبر كافر إلا بشرته بالنار.

دراسة علة الحديث:

قال الإمام الدارقطني في حديث الباب: تفرد به إبراهيم بن سعد عن الزهري عن عامر بن سعد، عن أبيه. قلت: وهذه الطريق من حيث الإسناد صحيح لأن رجاله ثقات وتفرد إبراهيم بن سعد لا يضره. بحيث قال الإمام العجلي: ثقة⁷⁷ وقال الإمام أبو حاتم: ثقة⁷⁸ وذكره الإمام ابن حبان في الثقات وسكت عنه⁷⁹.

رأي الباحث:

- 1 : بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجاً للحديث بالسند الذي ذكره الإمام الدارقطني في كتبه الخاصة ولكنه أخرجه الأئمة الباقون.
- 2 : علل الإمام الدارقطني هذا السند بالتفرد فتعليقه صحيح لأنه ما روى هذا الحديث إلا إبراهيم بن سعد، عن الزهري، عن عامر بن سعد، عن أبيه
- 3 : إن رواية الإمام الدارقطني صحيح لأن رجال إسنادها ثقات.

النموذج الثالث: الرواية التي ذكر فيها التفرد وهي معلولة بالجرح في الراوي

مسند عبد الرحمن بن عوف رواية عبد الرحمن بن أبي ليلى عن عبد الرحمن بن عوف (94) 561 : حديث (أنه كَانَ يَقُولُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ) الحديث

قول الإمام الدارقطني:

قال الإمام الدارقطني: تفرد به ثابت بن صفيّة وهو أبو حمزة الثمالي⁸⁰ عنه⁸¹ 82.

تخريج الحديث:

- 1 : أخرجه الإمام الشاشي في مسنده بسنده من طريق أبي عبيد السري بن يحيى، نا أحمد بن يونس، نا أبو بكر بن عياش، عن ثابت الثمالي، عن عبد الرحمن بن أبي ليلى، عن عبد الرحمن بن عوف قال بمثله⁸³.
 - 2 : وأخرجه الإمام الطبراني بسنده في كتابه الدعاء من طريق حفص بن عمر بن الصباح ثنا محمد بن سعيد ثنا أبو بكر بن عياش به بمثله⁸⁴.
 - 3 : وأخرجه الإمام الطحاوي في شرح مشكل الآثار من طريق ابن أبي داود حدثنا أحمد بن عبد الله بن يونس حدثنا أبو بكر بن عياش به بمثله⁸⁵.
- سند الحديث ومثله:

بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجا للحديث بالسند الذي ذكره الإمام الدارقطني في كتبه الخاصة ولكنه أخرجه الأئمة بحيث أخرجه الإمام الشاشي في مسنده بسنده من طريق أبي عبيد السري بن يحيى، نا أحمد بن يونس، نا أبو بكر بن عياش، عن ثابت الثمالي، عن عبد الرحمن بن أبي ليلى عن عبد الرحمن بن عوف عن النبي: أنه كان يقول في الصلاة على الميت: «اللهم اغفر لحينا وميتنا وشاهدنا وغائبنا وذكرنا وأنثانا وصغيرنا وكبيرنا من أحبيته منا فأحيه على الإسلام ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان»

دراسة الحديث:

قال الإمام الدارقطني في حديث الباب: تفرد به ثابت الثمالي عن عبد الرحمن بن أبي ليلى عن عبد الرحمن بن عوف رضي الله عنه.

قلت: إن الطريق المشار إليها ضعيف لأن في إسناد الحديث يكون ثابت بن صَفِيَّة وهو ضعيف رافضي وهو تفرد في الإسناد.

قال الإمام يحيى بن معين في تضعيفه: "ليس بشيء" ⁸⁶ وقال الإمام أحمد بن حنبل: "ضعيف الحديث" ⁸⁷.

وقال الإمام أبو زرعة: "كوفي لين" وقال الإمام أبو حاتم: "لين الحديث، يكتب حديثه ولا يحتج به" ⁸⁸.

وقال الإمام ابن حجر: "كوفي ضعيف رافضي" ⁸⁹.

رأي الباحث:

1 : بعد البحث والتحقيق ما وجدت مخرجا للحديث بالسند الذي ذكره الإمام الدارقطني في كتبه الخاصة ولكنه أخرجه الأئمة الباؤون في مصنفاتهم.

2 : علل الإمام الدارقطني هذا السند بالتفرد فتعليله صحيح لأنه ما روى هذا الحديث إلا ثابت الثمالي، عن عبد الرحمن بن أبي ليلى، عن عبد الرحمن بن عوف رضي الله عنه.

3 : إن رواية الإمام الدارقطني ضعيف لأن في الإسناد يكون ثابت بن صَفِيَّة وهو ضعيف رافضي وليس للثابت متابع كي ينجز ضعفه.

رابعا: الخاتمة:

والآن آتي إلى تدوين أهم النتائج التي توصل إليها الباحث:

1 : أول من خدم لكتاب الأفراد والغرائب، الحافظ ابن طاهر المقدسي رحمه الله حيث قام باختصار أسانيده ومتونه وترتيب أطرافه بحسب الراوي الأعلى.

2 : ومن رتب الأفراد والغرائب أيضاً الحافظ علي بن أبي بكر الهيثمي في كتابه جمع أحاديث الغيلانيات والخلعيات وفوائد تمام وأفراد الدارقطني وفيه أحد عشر جزءا.

- 3 : رغم أن الحافظ المقدسي حفظ لنا بعض أجزاء كتاب الإمام الدارقطني ولكنه حرمانا من الأسانيد.
- 4 : وقد طبع كتاب أطراف الأفراد والغرائب طبعتين: وكان أول طبعة للكتاب: طبعة دار الكتب العلمية ببيروت، نشرت عام 1419هـ، بتحقيق: محمود محمد محمود حسن نصار والسيد يوسف، ثم طُبع الكتاب مؤخرًا عن دار التدمرية نشرت عام 1428هـ بتحقيق: جابر بن عبد الله السريّج.
- 5 : بعد مقارنتي بين النسختين اتضح لي أن طبع دار التدمرية يحتوي 6503 حديث وتليه ملحقاته من نفس الطبع بالأجزاء الثاني والثالث والثمانين بـ 110، ففي المجموع تصل هذه النسخة إلى 6613 حديث، مع أن طبع دار الكتب العلمية يحتوي 6400 حديث في حال أنها مليئة بالأخطاء الإملائية واختلطت تعليقات الإمام الدارقطني بعضها ببعض ولأجل هذا وجدت أن طبع دار التدمرية أدق وأفضل.
- 6 : جوهرية موضوع الغرابة والتفرد في رواية الحديث وأثرهما في قبول الحديث أو رده لأحدهما يعتبران من أهم القرائن في تحليل الحديث وكتب الأفراد والغرائب فإنه يعد من أمهات العلل ومصدرا من المصادر الأصلية فكتاب الإمام الدارقطني من أشهر الكتب التي هي مظنة الأحاديث الغرائب والأفراد.
- 7 : وفي الحقيقة أن التفرد والغرابة لهما أحوال متفاوتة وأحكام مختلفة ومن جعل لهما منهجا واحدا وحكم عليهما بحكم متحد فقد أخطأ خطأ فاحشا ولأجل هذا نبه الأئمة بالاعتدال عند الحكم بهذه الأحاديث.
- 8 : التفرد والغرابة بذاتهما ليسا بعلّة وتنفرد الراوي وغريب روايته لا يضران الراوي كما أن تفرد الثقة لا يقبل على الإطلاق وإنما القبول والرد موقوف على القرائن والمرجحات.
- 9 : التَّفَرُّد والمخالفة عاملان من عوامل إدراك العلة في الحديث، وكلمة التَّفَرُّد يدخل في إطارها العام من أنواع علوم الحديث مثل الشاذ والمنكر والغريب والفرد، وأن التعليل في كتب العلل يدور على الخطأ والوهم والغلط سواء كان في تعليل المسند بالمرسل أم بالعكس، أم تعليل الرفع بالوقف أم ضده، أم التعليل بالاضطراب أم بالتفرد، أم بعدم سماع الراوي ممن فوقه، أم التعليل بالزيادة أم بالنقص، أم بغيره.
- 10 : لا شك إن الإمام الدارقطني له معرفة جيدة واطلاع واسع على العلل وكتابه العلل من أكبر المصنفات في علم نقد الأخبار والآثار وقد وضع فيه خلاصة علمه وأبان العلل بأسلوب يجلي العلة ويبرزها كما أنه أعل الحديث وبين صوابه في كتابه الغرائب والأفراد بالاختلاف والتفرد.

الهوامش

- 1 : هدية العارفين أسماء المؤلفين وآثار المصنفين لإسماعيل باشا ج 2 ص 82
- 2 : التاج المكلل من جواهر مآثر الطراز الآخر والأول لأبي الطيب محمد صديق خان ص 106 رقم الراوي: 95
- 3 : وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان، لأبي العباس ابن خلكان، ج 4 ص 287 رقم الراوي: 619

- 4 : اختصار علوم الحديث لأبي الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري، ص 61
- 5 : لسان الميزان لأبي الفضل ابن حجر العسقلاني ج 1 ص 64 رقم الراوي: 161
- 6 : تزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة لعلي بن محمد الكنائي ج 1 ص 145 رقم الراوي: 31
- 7 : الرسالة المستطرفة لبيان مشهور كتب السنة المشرفة لأبي عبد الله الكنائي ص 170
- 8 : فهرسة ابن خير الإشبيلي لأبي بكر محمد بن خير 1 ص 195 رقم المسلسل: 410
- 9 : المنتقى من منهاج الاعتدال في نقض كلام أهل الرفض والاعتزال لشمس الدين أبي عبد الله محمد بن أحمد الذهبي ص 439
- 10 : تاريخ التراث العربي (علوم القرآن والحديث - التدوين التاريخي - الفقه - العقائد) للدكتور فؤاد سزكين، ج 4 ص 509
- 11 : المهروانيات = الفوائد المنتخبة الصحاح والغرائب لأبي القاسم يوسف بن محمد بن أحمد المهرواني، (المتوفى : 468هـ)، تخريج : الشيخ الإمام أبي بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي ج 1 ص 181
- 12 : خزانة التراث - فهرس مخطوطات، ج 107 ص 465 رقم المسلسل: 107947
- 13 : فهرسة ابن خير الإشبيلي لأبي بكر محمد بن خير ص 195 رقم المسلسل: 410
- 14 : أطراف الغرائب والأفراد المحقق: جابر بن عبد الله السريع، ج 1/ص 31
- 15 : سعد بن معاذ بن النعمان الأنصاري الأشهلي أبو عمرو سيد الأوس شهد بدرا واستشهد من سهم أصابه بالخنْدَق ومناقبه كثيرة خ، التقريب ص 232 رقم الترجمة : 2255
- 16 : محمد بن صالح بن دينار صدوق يخطيء من السابعة مات سنة ثمان وستين 4 التقريب ص 484 رقم الترجمة : 5961
- 17 : سعد بن إبراهيم بن عبد الرحمن بن عوف جد الذي قبله ولي قضاء المدينة وكان ثقة فاضلا عابدا من الخامسة مات سنة خمس وعشرين وقيل بعدها وهو ابن اثنتين وسبعين سنة ع، التقريب ص 230 رقم الترجمة : 2227
- 18 : عامر بن سعد بن أبي وقاص الزهري ثقة من الثالثة مات سنة أربع ومائة ع، التقريب ص، 287 رقم الترجمة : 3089
- 19 : وهو ثقة سبقت ترجمته في حديث رقم: 13
- 20 : أسعد بن سهل بن حنيف [وقيل: سعد بن سهل] الأنصاري أبو أمامة معروف بكنيته معدود في الصحابة له رؤية ولم يسمع من النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مات سنة مائة وله اثنان وتسعون ع، التقريب ص 104 رقم الترجمة : 402
- 21 : سعد بن مالك بن سنان بن عبيد الأنصاري أبو سعيد الخدري له ولأبيه صحة واستصغر بأحد ثم شهد ما بعدها وروى الكثير مات بالمدينة سنة ثلاث أو أربع أو خمس وستين وقيل سنة أربع وسبعين ع، التقريب ص 232 رقم الترجمة : 2253
- 22 : أطراف الغرائب والأفراد المحقق: جابر بن عبد الله السريع، ج 1/ص 126، رقم الحديث : 500
- 23 : السنن الكبرى للنسائي، نفس المرجع، ج 5/ص 403 رقم الحديث : 5906
- 24 : فضائل الصحابة لأبي عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي ص 36 رقم الحديث : 119
- 25 : المستدرک علی الصحيحین للحاکم، ج 2/ص 134 رقم الحديث : 2570
- 26 : مسند البزار، ج 3/ص 301 رقم الحديث : 1091
- 27 : المستخرج من الأحاديث المختارة مما لم يخرج به البخاري ومسلم لأبي عبد الله المقدسي ج 3/ص 188 رقم الحديث : 982
- 28 : مسند الحميدي، ج 1/ص 166 رقم الحديث : 149
- 29 : السنن الكبرى للإمام البيهقي، ج 9/ص 107 رقم الحديث : 18018

- 30 : الأسماء والصفات للإمام البيهقي ج 2 ص 321 رقم الحديث : 885
- 31 : شرح معاني الآثار للطحاوي ج 3 / ص 216 رقم الحديث : 5131
- 32 : شرح مشكل الآثار للطحاوي ج 3 / ص 153 رقم الحديث : 1121
- 33 : صحيح البخاري ج 4 / ص 67 رقم الحديث : 3043
- 34 : صحيح مسلم، ج 3 / ص 1388 رقم الحديث : 1768
- 35 : السنن الكبرى للنسائي، نفس المرجع، ج 5 / ص 402 رقم الحديث : 5905
- 36 : سنن أبي داود، ج 4 / ص 355 رقم الحديث : 5215
- 37 : مسند الإمام أحمد، ج 18 / ص 215 رقم الحديث : 11680
- 38 : مستخرج أبي عوانة، ج 4 / ص 264 رقم الحديث : 6718
- 39 : صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، ج 15 / ص 497 م الحديث : 7026
- 40 : الأدب المفرد للإمام البخاري، ص 325 رقم الحديث : 945
- 41 : فضائل الصحابة للنسائي ص 35 رقم الحديث : 116
- 42 : مسند أبي يعلى الموصلي، ج 2 / ص 405 رقم الحديث : 1188
- 43 : المنتخب من مسند عبد بن حميد، ص 307 رقم الحديث : 995
- 44 : السنن الكبرى للإمام البيهقي، ج 6 / ص 95 رقم الحديث : 11314
- 45 : شعب الإيمان للبيهقي ج 11 / ص 269 رقم الحديث : 8528
- 46 : الآداب للإمام البيهقي ص 97 رقم الحديث : 241
- 47 : شرح السنة لمحيي السنة، للبغوي، ج 11 / ص 93
- 48 : حلية الأولياء وطبقات الأصفياء لأبي نعيم الأصبهاني، ج 3 / ص 171
- 49 : مصنف ابن أبي شيبة، ج 7 / ص 397 رقم الحديث : 36830
- 50 : سنن سعيد بن منصور لأبي عثمان سعيد بن منصور الخراساني الجوزجاني ج 2 / ص 396 رقم الحديث : 2964
- 51 : الأموال لابن زنجويه ج 1 / ص 343 رقم الحديث : 537
- 52 : الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع لأبي بكر أحمد بن علي الخطيب البغدادي ج 1 / ص 185 رقم الحديث : 300
- 53 : الثقات لابن حبان، ج 6 ص 375
- 54 : الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ج 4، ص 79 رقم الراوي: 342.
- 55 : الطبقات لابن سعد، ج 7 ص 246، رقم الراوي: 3326.
- 56 : الثقات للعجلي، ج 1 ص 389 رقم الراوي: 558.
- 57 : الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ج 7، ص 287 رقم الراوي: 1558.
- 58 : التاريخ الكبير للإمام البخاري، ج 1، ص 117 رقم الراوي: 340
- 59 : مَنْ تَكَلَّمَ فِيهِ الدَّارِقُطِيُّ فِي كِتَابِ السَّنَنِ مِنَ الضَّعْفَاءِ وَالتَّرْوَكِينِ لِلْإِمَامِ ابْنِ زُرَيْقٍ، ج 3، ص 119 رقم الراوي: 345
- 60 : الثقات لابن حبان، ج 4 ص 270.

- 61: الثقات للعجلي، ج 2 ص 240، رقم الراوي: 1608
- 62: الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ج 4، ص 369.
- 63: الثقات للعجلي، ج 1، ص 220.
- 64: الطبقات الكبرى لابن سعد، ج 7، ص 207.
- 65: العلل الواردة في الأحاديث النبوية للدارقطني، ج 4 / ص 332 رقم السؤال : 605
- 66 : وهو ثقة سبقت ترجمته في حديث رقم: 35
- 67 : وهو ثقة سبقت ترجمته في حديث رقم: 4
- 68 : وهو ثقة سبقت ترجمته في حديث رقم: 27
- 69 : أطراف الغرائب والأفراد المحقق: جابر بن عبد الله السريع، ج 1/ ص 128، رقم الحديث : 504
- 70: المعجم الكبير للإمام الطبراني ، ج 1 / ص 145 رقم الحديث : 326
- 71 : المستخرج من الأحاديث المختارة مما لم يخرج به البخاري ومسلم لأبي عبد الله المقدسي ج 3 / ص 214 رقم الحديث : 1005
- 72 : عمل اليوم والليلة سلوك النبي مع ربه عز وجل ومعاشرته مع العباد لابن السني ص 546 رقم الحديث : 595
- 73 : دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة للإمام البيهقي، ج 1 / ص 191
- 74 : معرفة الصحابة لأبي نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني ج 1 / ص 139 رقم الحديث : 522
- 75 : أحاديث الشيوخ الثقات (المشيخة الكبرى) للقاظمي المارستان، ج 2 / ص 776 رقم الحديث : 254
- 76 : التوحيد لله عز وجل لعبد الغني بن عبد الواحد المقدسي ص 86 رقم الحديث : 70
- 77: الثقات للعجلي، ج 1 ص 52 رقم الراوي: 23
- 78: الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ج 2 ص 102، رقم الراوي: 283
- 79: الثقات لابن حبان، ج 2 ص 7 رقم الراوي: 6485
- 80 : وهو ضعيف رافضي، سبقت ترجمته في حديث رقم: 58
- 81 : عبد الرحمن بن أبي ليلى الأنصاري ثقة، سبقت ترجمته في حديث رقم: 53
- 82 : أطراف الغرائب والأفراد المحقق: جابر بن عبد الله السريع، ج 1/ ص 138، رقم الحديث : 561
- 83 : مسند الشاشي، ج 1 / ص 283 رقم الحديث : 253
- 84 : الدعاء للطبراني، ص 353 رقم الحديث : 1165
- 85 : شرح مشكل الآثار للطحاوي، ج 2 / ص 427 رقم الحديث : 966
- 86: تاريخ ابن معين برواية الدوري، ج 3 / ص 278، رقم الراوي: 1335
- 87: العلل ومعرفة الرجال، ج 3 / ص 80 رقم الراوي: 4267.
- 88: الجرح والتعديل لابن أبي حاتم ج 3 / ص 451، رقم الراوي: 1813
- 89: ابن حجر، تقريب التهذيب، ج 1 / ص 132 رقم الراوي: 818

PROHIBITED SOURCES OF EXPENDITURE IN ISLAMIC ECONOMICS PERSPECTIVE

المصادر الممنوعة للإنفاق في الاقتصاد الإسلامي

منظور أحمد الأزهرى أستاذ الشريعة المشارك - جامعة هائى تك - تاكسيلا - باكستان

علي أكبر الأزهرى أستاذ الشريعة المشارك - جامعة لاهور جيريون - لاهور

ظهور الله الأزهرى أستاذ الشريعة المشارك - جامعة لاهور - لاهور

ABSTRACT: To earn from legal sources is a fundamental principal of Islamic Economics. Many divine orders define it leaving no space for unlawful earnings from whatsoever means of income. The Halal earnings have been given a sacred status in human dealings and they have been declared obligatory for every true believer. Many a prophets of Allah SWT earned by their own hand work to illustrate this great meaning for men. This article indicates to major prohibited things for the sake of knowledge and advice to all those who listen to the word of Allah SWT sent through His Beloved Prophet PBUH.

Keywords: Halal Earnings, Prohibited Sources, Islamic Economics.

تمهيد:

من القوانين الأساسية في الاقتصاد الإسلامي أن يكون الإنفاق من الأموال المكتسبة من المصادر المشروعة، فلا يجوز للمسلم أن ينفق من أموال الحرام يقول الله سبحانه:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ" (1).

فالآية واضحة في بيان الإنفاق من الطيبات، وتعني أن الإنفاق لا بد أن يكون من الأموال المكتسبة بطريقة

مشروعة "لأن الله طيب لا يقبل إلا طيباً" (2).

وكسب الحلال فريضة، يقول الله تعالى: "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا" (3). والفضل هو الرزق

الحلال.

وقال تعالى: "وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ" (4).

"لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ" (5).

"وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" (6). "وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ" (7).

وكسب الحلال طريق الأنبياء المرسلين، وذكر الحاكم من حديث ابن عباس أن سيدنا آدم عليه السلام، كان

يعمل حراثاً ونوح وزكريا عليهما السلام كانا يعملان بالنجارة وإدريس عليه السلام، بالخياطة وإبراهيم عليه

السلام، بالبزاة وكان موسى عليه السلام يرعى الغنم ويحكي القرآن الكريم عن سيدنا داود عليه السلام "وَأَلَّا لَهُ

الْحَدِيدِ" (8). "وَعَلَّمَنَاهُ صَنْعَةَ نَبُوسٍ لَّكُمْ" (9).

والرسول الكريم عليه الصلاة والسلام كان يحرى الغنم لعقبة أبي معيط و يقول عليه الصلاة والسلام: "طلب الحلال كمقارعة الأبطال ومن بات كالأ من طلب الحلال بات مغفورا له" (10).

وسيدنا عمر رضى الله عنه كان يقدم درجة الكسب على درجة الجهاد (11). ويقول: "لأن أموت بين شعبي رحلي أضرب في الأرض، أبتغي من فضل الله أحب إلي من أن أقتل في سبيل الله، لأن الله تعالى قدم الذين يضربون في الأرض يبتغون من فضل الله على المجاهدين بقوله تعالى: ﴿وَأَخْرَجُوا يَتَرُفُونَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَأَخْرَجُوا يَتَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾" (12).

ويقول رضى الله عنه: "إني لا أجد هذا المال يصلحه إلا خلال ثلاث: أن يؤخذ بالحق ويعطى في الحق ويمنع من الباطل" (13). وهذا الأثر يشمل كافة معاني الخير للكسب والإنفاق، ولأن يكون المال حلال يجب أن يكون مكتسبا من العمل المشروع فلهذا يحرص الإسلام على توجيه أبنائه إلى العمل ويوجهه لأجل البناء والرخاء.

وهناك بعض الأمور التي لا يقرها الشرع الإسلامي لمفاسدها الظاهرة أو المعنوية ويحتاج إلى معرفتها كثير من الناس فنذكر بعض أهم البيوع والمعاملات والصناعات المحرمة شرعاً بالإختصار. وذلك في فروع ثلاثة:

الفرع الأول: البيوع الممنوعة:

الفرع الثاني: المعاملات المحرمة

الفرع الثالث: الصناعات والحرف الممنوعة بالله التوفيق

الفرع الأول البيوع الممنوعة:

ينقسم البيع عند جمهور الفقهاء إلى صحيح وغير صحيح؛ فالصحيح ما استوفى شروطه وأركانه، وغير الصحيح ما اختل فيه ركن من أركانه أو شرط من شروطه وهذا البيع يشمل البيع الباطل والفساد لأنهما بمعنى واحد عند الجمهور.

أما الحنفية: فيقسمون البيع إلى صحيح وباطل وفساد.

أما البيع الصحيح: هو ما كان مشروعاً بأصله ووصفه ولم يتعلق به حق الغير ولا خيار فيه.

والبيع الباطل: هو ما لا يكون مشروعاً بأصله ولا بوصفه أي لا يصدر عن الأهل مثل الصبي أو المجنون أو محل

العقد لا يصلح للبيع مثل الخمر والخنزير.

والبيع الفاسد: هو ما كان مشروعاً بأصله دون وصفه أي: يصدر من الأهل وفي محل قابل للبيع لكن يعرضه

أمر أو وصف غير مشروع فيصير فاسداً مثل بيع المجهول جهالة تؤدي للتراجع كبيع دار أو سيارة مملوكة للغير، ثبت

فيه الملك عند الحنفية بالقبض بإذن المالك صراحة أو دلالة خلافاً للجمهور فإنهم يعتبرونه بيعاً باطلاً لا يتعقد

أصلاً (14).

ومن البيوع الممنوعة:

- ١ - بيع المعدوم: لا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم عند أئمة المذاهب الأربعة لأن النبي عليه الصلاة والسلام: "نهى عن بيع جبل الحبله" (15). أى: نتاج التاج و "نهى أيضاً عن بيع المضامين والملاقيح". والمضامين ما في أصلاب الذكور. والملاقيح ما في بطون الإناث. ونهى كذلك عن بيع الثمر قبل بدو صلاحه. ومن بيع المعدوم مثلاً بيع اللبن في الضرع والصوف على ظهر الغنم. وقال الإمام مالك: "يجوز بيع اللبن في الضرع في الغنم السائمة التي لا يختلف لبنها لا في الشاة الواحدة، أيما معلومة إذا عرف قدر حلابها لسقي الصبي كلبن الظئر لتسامح غالب الناس به أيما معلومة غالباً، ويصح بيع الصوف على ظهر الغنم لأنه مشاهد يمكن تسليمه" (16).
- ٢ - بيع معجوز التسليم:

لا يجوز بيع معجوز التسليم عند العقد كالطير في الهواء والسماك في الماء والعبد الآبق فيكون البيع باطلاً عند الحنفية. وقال المالكية: "لا ينعقد بيع البعير الشارد والبقرة المتوحشة والمغصوب إلا أن يبعة من غاصبه". وقال الشافعية والحنابلة: "لا يجوز بيع مالا يقدر على تسليمه كالطير في الهواء والسماك في الماء والجمل الشارد والفرس العائر والمال المغصوب في يد الغاصب أو العبد الآبق سواء علم مكانه أو جهل و مثله بيع الدار أو الأرض تحت يد العدو؛ لأن النبي عليه الصلاة والسلام نهى عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر" (17). والمراد بالماء الذي لا يجوز بيع السمك فيه هو الماء غير المحصور كالبحر والنهر فإن كان الماء محصوراً كالبركة فقال الحنفية والشافعية والحنابلة: يجوز بيع السمك فيه إذا كان يمكن أخذه بدون اصطيداء وحيلة لكن للمشتري خيار الرؤية عند الحنفية وقال المالكية: "لا يجوز بيع السمك في الغدير أو البركة" (18).

٣ - بيع الغرر:

معني الغرر لغة: الخداع واصطلاحاً: قال السرخسي: "الغرر ما يكون مستور العاقبة" (19). وقال القرافي المالكي: "أصل الغرر هو الذي لا يدري هل يحصل أم لا كالطير في الهواء والسمك في الماء" (20). وقال الشيرازي: "الغرر ما انطوى عند أمره وخفي عليه عاقبته" (21). وقال ابن حزم: "ملا يدري المشتري ما اشترى أو البائع ما باع" (22). لما ورد "أن النبي عليه الصلاة والسلام نهى عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر" (23). حكمه: قد اتفق الفقهاء على عدم صحة بيع الغرر، ومن البيوع غير الصحيحة بسبب الغرر بيع

المضامين والملاقيح وبيع الملامسة والمناودة والحصاة وبيع المزانة وبيع المحاقلة وبيع ضربة الغائص.

فالبيع في هذه البيوع مجهول القدر والذات فلا يصح بيعه وكذلك لا يجوز بيع الحاضر للبادي للنهي الوارد في

الحديث: "لا يبيع حاضر لباد" (24).

4: بيع النجس: كذلك ممنوع وهو البيع الذي يريد فيه الرجل في السلعة وليس له حاجة بها إلا ليغلي ثمنها

وينفع صاحبها وهو حرام لحديث ابن عمر رضى الله عنه: "نهى رسول الله عليه الصلاة والسلام عن

النجس" (25).

5: بيع المضامين: "هو بيع ما في أصلاب الذكور من المتي، والملاقيح ما في بطون الأمهات من الأجنة

وواحدها: ملقوحة" (26).

6: بيع الملامسة: "مثل أن يقول البائع: بعثك ثوبي هذا على انك متي لمسته أو إن المسته أو أي ثوب من هذه

الأثواب لمسته فهو لك".

7: بيع المناودة: "مثلاً يقول البائع: إن أو متي نبذت هذا أو أي ثوب نبذته لك فهو لك بكذا.

8: بيع الحصاة: "أن يقول البائع، ارم بهذه الحصاة فعلى أي ثوب وقعت فهو لك بكذا أو بعثك هذه الأرض

ما انتهت إليه الحصاة في الرمي".

9: بيع المزانة: "هو بيع الرطب أو العنب على النخل أو الكرمة بتمر مقطوع".

10: بيع المحاقلة: "هو بيع الحنطة في سنبلها بحنطة مثل كيلها خرصاً لأن النبي عليه الصلاة والسلام نهى عن

بيع المزانة والمحاقلة" (27).

11: بيع ضربة القائص: "هو أن يقول البائع: بعثك ما يخرج من إلقاء هذه الشبكة مرة بكذا".

12: بيع ضربة الغائص: "بأن يقول البائع: أغوص غوصة فما أخرجته من اللآلي فهو لك بكذا".

كل هذه الأنواع (28) من البيع محرمة فلا يجوز لمسلم أن يكسب بها شيئاً من زرقه.

13: بيع النجس والمنتجس: لا ينعقد بيع الخمر والخنزير والدم عند الحنفية؛ لأنها ليست بمال أصلاً فكسب

بأعها سحت حرام، ويكره بيع العذرة ولا بأس ببيع السرقيين أو السرجين -وهو الزبل- وبيع البعر لأنه منتقع به

لأنه يلقي الأرض لأستكنار الريع فكان مالاً و يصح بيع كل ذي ناب من السباع كالكلب والفهد والأسد

والأصطياد. ويصح بيع المنتجس والانتفاع به في غير الأكل كالديغ والدهان والاستضاءة به في غير المسجد ما عدا

دهن الميتة فإنه لا يحل الانتفاع به.

والقاعدة عند الحنفية في ذلك "أن كل ما فيه منفعة تحل شرعاً فإن بيعه يجوز" (29) لأنه الله تعالى خلق ما في الأرض جميعاً لمنفعة الإنسان كما ورد في كثير من آيات القرآن الكريم.

وقال المالكية: "لا ينعقد بيع الخمر والخنزير والميتة ولا ينعقد بيع الكلب مع كونه طاهراً سواء أكان يبيع كلب صيد أو حراسة" لأنه نهي عن بيعه كما ورد في الحديث: "نهى النبي عليه الصلاة والسلام عن ثمن الكلب ومهر البغي وحلوان الكاهن" (30).

ولا ينعقد بيع المتنجس الذي لا يمكن تطهيره كزيت وعسل وسمن وقعت فيه نجاسة، وقال الشافعية والحنابلة لا يجوز بيع الخمر والخنزير والدم والميتة ولا يجوز ثمن الكلب أيضاً للنهي الوارد في ذلك.

ويصح بيع المتنجس الذي يمكن تطهيره كالثوب "ولا يجوز بيع النجاسات كالسرجين" (31).

الفرع الثاني

المعاملات المحرمة

لا يحل لمسلم أن يزرع أو ينتج أو يتاجر في الأشياء المحرمة، فمن زرع المخدرات والنباتات المسكرة مثل الحشيش والبانجو والخشخاش والكروم للخمر وكل ما يضر الناس تناوله بالأكل أو الشرب أو المضغ أو التدخين أو الاستعاط أو الحقن أو من يعمل بإنتاج الأفلام المثيرة وصنع الملابس الخليعة وغير ذلك فقد ارتكب الحرام واستوجب العقاب لأن كل هذه الأشياء إنتاجها حرام وكذلك الاتجار بها.

ومن اشتغل بالوظائف المحرمة أو بصناعة وتجارة الأصنام والتماثيل وأواني الذهب والفضة والأفلام الجنسية والمطبوعات الفاحشة وغير ذلك من المواد الضارة فكان آثماً وشريكاً في معاصي الآخرين؛ لأنه يسر للناس ارتكاب الحرام وأرشدتهم إلى طريق الضلال وكل ما كسبه من هذا العمل سحت خبيث وكل لحم نبت من الحرام فالنار أولى به.

الربا وفوائد البنوك:

الربا: لغة هو النمو والزيادة، يقال ربا الشيء ربوا أي زاد ونما ومنه قوله تعالى: ﴿وَيَرْبِي الصَّدَقَاتُ﴾ (32).

وفي الاصطلاح الشرعي: "الربا هو الفضل الخالي عن العوض في البيع" (33).

وعند الحنفية أيضاً: "هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال، ويقصد به فضل مال ولو حكماً فيشمل التعريف حينئذ ربا النسئنة والبيوع الفاسدة باعتبار أن الأجل في أحد العوضين فضل حكمي بلا عوض مادي والأجل يبذل بسببه عادة عوض زائد" (34).

أدلة تحريم الربا:

إن الربا محرم بنصوص القرآن والسنة والإجماع.

أما القرآن الكريم فقولته تعالى: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (35).

أما السنة النبوية: فقولته عليه الصلاة والسلام عن جابر رضى الله عنه قال: "لعن رسول الله عليه الصلاة والسلام أكل الربا مؤكله وشاهده وكاتبه" (36).

وأجمع العلماء على تحريم الربا وحكمة تحريمه كما ذكرها الإمام فخر الرازي في تفسيره كالتالي:

أولاً: "إن الربا يقتضي أخذ مال الإنسان من غير عوض؛ لأن من يبيع الدرهم بالدرهمين يحصل له زيادة درهم من غير عوض. ومال الإنسان متعلق بحاجته وله حرمة عظيمة - كما في الحديث: "حرمة مال الإنسان كحرمة دمه" فوجب أن يكون أخذ ماله من غير عوض محرماً.

ثانياً: أن الله تعالى إتما حرم الربا من حيث إنه يمنع الناس من الاشتغال بالمكاسب وذلك لأن صاحب الدرهم إذا تمكن بواسطة عقد الربا من تحصيل الدرهم الزائد، نقداً كان أو نسيئة خف عليه اكتساب وجه المعيشة، فلا يكاد يتحمل مشقة الكسب والتجارة والصناعات الشاقة، وذلك يفضي إلى انقطاع منافع الخلق ومن المعلوم أن مصالح العالم لا تنتظم إلا بالتجار والحرف والصناعات والعمارات.

ثالثاً: قيل السبب في تحريم عند الربا إنه يفضي إلى انقطاع المعروف بين الناس من القرض، لأن الربا إذا حرم طالبت النفوس بقرض الدرهم واسترجاع مثله ولو حل الربا لكانت حاجة المحتاج تحمله على أخذ الدرهم بدرهمين فيفضي ذلك إلى انقطاع المواساة المعروف والإحسان.

رابعاً: هو إن الغالب أن المقرض يكون غنياً والمستقرض يكون فقيراً، فالقول بتجويز عقد الربا تمكين للغني من أن يأخذ من الفقير الضعيف مالاً زائداً غير جائز برحمة الرحيم.

خامساً: أن حرمة الربا قد ثبتت بالنص، ولا يجب أن يكون حكم جميع التكاليف معلوماً للخلق، فوجب القطع بحرمة عقد الربا وإن كنا لا نعلم الوجه فيه" (37).

ولا شك أن هذه الأغنياء فقط فيرداد الغني غني والفقير فقرا وذلك غير مقبول إسلامياً.

ولأن الربا يترتب عليه أمور شرعية واقتصادية غاية في الخطورة منها إنه مخالف لحكم الله، واقتصادياً معلوم أن الفوائد تدخل في تكلفة الإنتاج كأحد عناصره وبالتالي يتحمل بها المنتج النهائي، فتعمل على رفع الأسعار الذي يزيد الضغط الاقتصادي على المستهلكين وبصفة خاصة ذوي الدخل المحدودة.

كذلك فإن مضار الفوائد على اقتصاديات البلدان المقرضة واضح وملحوس حيث إنها تمثل ضغطاً على الموارد المالية والمقرضة مما يعوق عملية التنمية ومن ناحية أخرى ارتفاع أسعار الفائدة يضاعف من أعباء سداد فوائد الديون التي ربما تسبب فقدان بعض البلدان لحريتها السياسية وخضوعها للاستعمار المسلح. فالربا داء متعد ومزمن يزيد يوماً بعد يوم في المتاعب الاقتصادية والاجتماعية والسياسية فلا يجوز المعاملة به في أي حال من الأحوال.

فوائد البنوك: هي الربا المحرم لأن البنوك التقليدية تتاجر في الديون والقروض الائتمان بفوائد محدودة وبدون عمل وجهد لأنها لا تبيع ولا تشتري ولا تزرع ولا تصنع ولا تشارك، فهي تأخذ لقروض من هنا وهناك بفائدة محدودة ١٢% مثلاً ثم تعطيها لآخرين بفائدة أكبر ١٨% مثلاً والفرق بين الفائدتين هو ربح البنك ولا تميز بين ربا الاستهلاك و ربا الإنتاج.

أما الأول فخاص بحاجات الإنسان الاستهلاكية.

والثاني خاص بالاستثمار والإنتاج.

وقد صدرت قرارات علماء المسلمين في المؤتمر المنعقد في شهر الحرم سنة 1385هـ (مايو 1965). مجمع البحوث الإسلامية بالأزهر الشريف في هذا الشأن. وقد شارك في هذا المؤتمر عدد كبير من رجال الفقه والقانون والاقتصاد والاجتماع، وفيما يلي نص القرارات: (38).

١ - الفائدة على أنواع القروض كلها ربا محرم، لا فرق في ذلك بين ما يسمى بالقرض الاستهلاكي وما يسمى بالقرض الإنتاجي لأن نصوص الكتاب والسنة في مجموعها قاطعة في تحريم النوعين.

٢ - كثير الربا وقليله حرام كما يشير إلى ذلك الفهم الصحيح في قوله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ (39).

٣ - الإقراض بالربا محرم لا تبيحة حاجة ولا ضرورة، والإقراض بالربا محرم كذلك ولا يرتفع إثم إلا إذا دعت إليه الضرورة الملحة وكل امرئ متروك لدينه في تقدير ضرورته.

٤ - أعمال البنوك من الحسابات الجارية وصرف الشيكات وخطابات الاعتماد الكميالات الداخلية التي يقوم عليها العمل بين التجار والبنوك في الداخل كل هذا من المعاملات المصرفية الجائزة، وما يؤخذ في نظير هذه الأعمال ليس من الربا.

٥ - الحسابات ذات الأجل وفتح الاعتماد بفائدة وسائر أنواع الإقراض نظير فائدة كلّها من المعاملات الربوية وهي محرمة.

وصدرت عدة قرارات مثلها من مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي والمجمع الفقهي التابع لمرابطة العالم الإسلامي وكذلك مؤتمر المصارف الإسلامية بالكويت ولجنة الفتوى بالأزهر الشريف، وكل هذه القرارات تنص على تحريم المعاملات بالربا ما عدا المعاملات المصرفية الجائزة.

شهادات الاستثمار:

هي نوع من القروض بين الحكومة - ممثلة في البنك - وبين الممولين من أفراد الشعب والحكومة تستقرض الناس ليساهموا في مشروعاتها أو نفقاتها، والراغبون من أبناء الشعب يقرضونها ويتقاضون على قرضهم «فوائد

محددة» يعيّن البنك في كل عام بنسبة مئوية معلومة 10% مثلاً أو أكثر، المهم إنها منسوبة إلى رأس المال وليس إلى الربح وأنها تحدد عند الدفع في كل عام وقد تختلف من عام لآخر، شأن هذه الشهادات شأن كل الفوائد الربوية (40)، ويؤيده الفتوى الصادرة من دار الإفتاء المصرية بشأن شهادات الاستثمار في 9 ديسمبر 1979م ونصه ما يلي:

” لما كان الوصف القانوني الصحيح لشهادات الاستثمار أنها قرض بفائدة، فإن فوائد تلك الشهادات وكذلك فوائد التوفير أو الإيداع بفائدة تدخل في نطاق ربا الزيادة لا يحل لمسلم الانتفاع بها، أما القول بأن هذه الفائدة تعتبر مكافأة من ولي الأمر فإن هذا النظر غير وارد بالنسبة للشهادات ذات العائد المحدد مقدماً، وقد يجري هذا النظر في الشهادات ذات الجوائز دون الفوائد“ (41).

وتوالى فيما بعد عدة فتاوى من دار الفتوى المصرية بهذا الشأن وكلّها تؤكد على هذا المعنى، والحاصل أن الزيادة المشروطة مقدماً على رأس المال مقابل الأجل وحده من الربا المحرّم أيّا كان شكله، واسمه.

البنوك المتخصصة:

هي البنوك التي تقدم التمويلات اللازمة للزراعة أو الصناعة أو العقارات وما يشبهها من مشروعات التنمية، ثم تأخذ من أصحاب المشروعات مقابل ذلك مبالغ مناسبة يقدرها الخبراء العدول على أنه أيجور أو مصروفات إدارية. وهذا النوع من الأجر جائز لا بأس به (42) لأنه في مقابل خدمات معينة تقدمها البنوك للناس في إنجاز مشروعاتهم النافعة.

الرشوة:

قال الإمام الجرجاني ”الرشوة ما يعطي لإبطال الحق أو لإحقاق الباطل“ (43). والمرثشي هو القابض للمال والرائش: هو الواسطة بين الراشي والمرثشي يسعى بينهما حتى تتم لهما الصفقة. وفي الحديث الشريف: ”الراشي والمرثشي كلاهما في النار“ (44).

حكمها: إن الرشوة سحت حرام وصاحبها فاسق باتفاق العلماء وقال الله تعالى: ﴿سَمَاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكْثَرُونَ لِلسُّخْتِ﴾ (45).

وفي الحديث: ”كل لحم أنبته السحت فالنار أولى به قيل يا رسول الله وما السحت؟ قال: «الرشوة في الحكم» (46).

وكل مال يدفع لحصل المنصب أو الوظيفة فهو حرام على الآخذ والمعطي وكذلك دفع المال للقاضي أو الموظف أو الحاكم لإنجاز عمل داخل في وظيفته وهذا أكل المال بالباطل، وقد نهي الله سبحانه عنه في قوله وتعالى: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا قَرِيبًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (47).

ومن الرشوة المحرمة دفع المال للتوصل من حق واجب على الإنسان بالشرع، وفاعل ذلك ملعون (48).

الرشوة لدفع الضرر أو حصول الحق:

اختلف العلماء في هذه المسألة إلى رأيين:

الرأي الأول: أن الرشوة كلها ممنوعة سواء كانت لدفع الضرر أو الوصول إلى الحق لأن النصوص الواردة فيها لتمييز بينهما، فهي على عمومها في تحريم الرشوة سواء كانت الرشوة مدفوعة في الباطل أو الوصول إلى الحق، قال ابن رسلان: "ويدخل في إلحاق الرشوة. الرشوة للحاكم والعامل على أخذ الصدقات وهي حرام بالإجماع" (49).

الرأي الثاني: جوز بعض العلماء إعطاء المال ليدفع الإنسان عن نفسه ضرراً أو يصل به إلى حق واجب له، وقالوا: إن مثل هذا يجوز للدافع ويحرم على الآخذ كما كان النبي عليه الصلاة والسلام يقول: إن أحدهم ليسألني المسألة فأعطينها إياه فيخرج بها متأبطها وما هي لهم إلا نار، قيل يا رسول الله فلم تعطيهم؟ قال: "إنهم يأبون إلا يسألوني ويأبى الله لي البخل" (50). قال المنصور بالله وأبو جعفر وبعض أصحاب الشافعي: وإن طلب بذلك حقاً مجعاً عليه جاز (51).

وفيه قال ابن الأثير: "فأما ما يعطي توصلًا إلى أخذ حق أو دفع ظلم فغير داخل في معنى الرشوة". وروي عن جماعة من أئمة التابعين قالوا: لا بأس بأن يصانع الرجل عن نفسه وماله إذا خاف الظلم ومن نقل عنه هذا القول من التابعين عطاء ووهب وجابر بن زيد (52).

وإذا كان لأحد لا بد من الأخذ بهذا القول فلا ينبغي له أن يتجاوز الحدود لأن الضرورة تقدر بقدرها فليس له أن يأخذ الرشوة سبيلاً إلى التوسع في الأعمال والتجارة وحصول المباني والعقارات فيفتح بذلك باب الفساد والحرام بل لو كان المجتمع يصبر ويرفض طموحات المرتشين لكانوا رجعوا إلى الصواب ونجوا من الذل والعذاب.

الهدية إلى الحكام:

ما اعتاده الناس في الإهداء إلى الحكام يمنع منه الإسلام. فلا يجوز لأحد أن يعطي شيئاً إلى موظف أو حاكم أو قاض لم يكن يعطيه لو لا وظيفته ومنصبه ذلك، فهذه الهدية حرام أخذها وإعطاءها لأنها في معنى الرشوة وإن سميت بمسميات أخرى. وإن لم تكن الهدية لأجل المنصب والوظيفة بل كانت العادة جرت عليه قبل ذلك فلا تحرم إلا إذا كانت بين يدي خصومة أو قضاء حاجة فيحرم أخذها. فقد جمع اليهود لعبد الله بن رواحة حلياً حيث بعثه إليهم رسول الله عليه الصلاة والسلام ليخرص عليهم النخل فأهدوه له فقال: "هذه الرشوة سحت وإن لا نأكلها" (53). وإن كانت الهدية شكراً وتكريماً للعامل لأجل معاملته الطيبة فالأولى له أن لا يقبلها قال الإمام ابن الجوزي: "حدثنا أبو المليح عن ميمون. قال: أهدي إلى عمر بن عبد العزيز تفاح وفاكهة فردها وقال: لا أعلم أنكم

يعتزم إلى أحد من أهل عملي شيئاً. قيل له: ألمة يكن رسول الله عليه الصلاة والسلام يقبل الهدية؟ قال: بل! ولكنها لنا ولمن بعدنا رشوة" (54).

وإذا قبل من أعطي له الهدية مكافأة له على عمله وأخذها فلا يجوز له أن يستأثر بها بل تكون للمسلمين يتصدق بها علي المحتاجين منهم إلا أن يكفي صاحبه من ماله فتكون خالصة له. وإذا ارتشي العامل أو الموظف أو قبل هدية ليست من حقه فالواجب عليه أن يردها إلى أصحابها لأنه أخذها بغير حق فاشتبهت المأخوذ بعقد باطل وإذا استهلكت وفاتت فالواجب عليه قيمتها يوم قبضها على القاعدة في العقود الفاسدة (55).

الفرع الثالث

الصناعات والحرف الممنوعة

حيث إن الأصل في الأشياء الإباحة، أباح الإسلام شتى أنواع الصناعات والحرف النافعة للبشرية إلا التي تضر المجتمع في عاداته وأخلاقه ودينه فيحاربها الإسلام لأن مبدأ مشروعية مصادر الكسب يبنى على عدم الضرر للآخرين كما ورد في الحديث: "لا ضرر ولا ضرار" (56).

ومن الصناعات والحرف الممنوعة:

صناعة المسكرات والمخدرات:

من حكمة الإسلام في التشريع سد الذرائع فلا يسمح من الوهلة الأولى صناعة الأشياء الضارة ثم إعلان منعها ومطالبة عدم تعاطيها، بل لا تنتظر الشريعة الإسلامية إنتاج هذه المواد المسمومة. وقد حرم الله تعالى الخمر بقوله سبحانه: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾، إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيُضِدِّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٥٧﴾.

وورد في الحديث: "لعن رسول الله عليه الصلاة والسلام في الخمر عشرة: عاصرها و معتصرها و شاربها و ساقها و حاملها و المحمولة إليه و بائعها و مبتاعها و واهبها و آكل ثمنها" (58). وأيضاً في الحديث: "كل مسكر خمر وكل خمر حرام" (59). والحاصل أن جميع ما يسكر كثيره فقليله حرام ويدخل في هذا كل لمسكرات والمخدرات مثل الحشيش والبانجو وغير ذلك.

البغاء: قد يندهش الإنسان حينما يعرف أن معظم البلاد الغربية تعد البغاء حرفة تتمتع بجميع التراخيص والحقوق الحرفية ولكن الإسلام يرفضه من أول يوم لشدة دناءته وفساده في الأرض فمنع القرآن الكريم احترام الزنا حيث أمر ﴿وَلَا تَكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبَغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (60).

"﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾" (61). فكل ما يقرب إلى الزنا ويحرض عليه و يعرفه الناس كان حراماً لأن القاعدة الفقهية تقول: كل ما أدى إلى الحرام فهو حرام.

قد ذكر الإمام الرازي سبب نزول الآية: "﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَانَكُمْ عَلَى الْبَغَاءِ﴾". بما جاء في الحديث: "أنه جاء عبد الله بن أبي -رأس المنافقين- إلى رسول الله عليه الصلاة والسلام ومعه جارية من أجمل النساء تسمى معاذة فقال: يا رسول الله: هذه لأيتام فلان أفلا تأمرها بالزنا فيصيبون من منافعها؟ فقال عليه السلام: لا". وعن جابر بن عبد الله: "جاءت جارية لبعض الناس فقالت: إن سيدي يكرهني على البغاء". فنزلت الآية (62).

الفنون الجنسية: لا يجوز احترام الفنون الجنسية مثل الرقص المثير والغناء الخليع والتمثيل الماجن وإنتاج الأفلام والمسلسلات والمسرحيات التي تدعو إلى الجنس والانحراف والجريمة وكل عبث من هذا النوع وإن سموه فنا وتقدما وما إلى ذلك ظلماً وزوراً.

وكذلك طباعة المجلات الجنسية وكتابة الروايات الفاحشة وصناعة الملابس الخليعة التي تثير الحساسيات والمشاعر وتدعو إلى الفتنة والفساد، كل ذلك فعله وكسبه لا يرضاء الله رسوله ولا يقبله قلب مؤمن.

نتيجة البحث:

والحاصل أنّ الأعمال المحرمة شرعاً لا يرضى بأيّ منها المؤمن الصحيح وهناك أبواب الرزق الحلال مفتوحة لأنّ الله تعالى له يحرم شيئاً إلا وقد أتى بأحسن منه، فالمعاملات عموماً مباحة إلا ما ورد التحريم فيه منصوصاً في الكتاب والسنة، والكسب الحلال طريق المؤمن إلى جنة الله تعالى في الآخرة كما هو وسيلته للنجاح والفلاح في الدنيا.

وبالله التوفيق

حواشي

- (1) البقرة، ۲/۲۶۷.
- (2) رواه مسلم، ك الزكاة، باب قول الصدقة من الكسب الطيب: ۷۰۳/۳، برقم 1015، دار الحديث بمصر 1991.
- (3) الجمعة، ۱۰/۶۲.
- (4) النساء، ۳۲/۴.
- (5) البقرة، ۱۹۸/۲.
- (6) النبأ، ۱۱/۷۸.
- (7) الأعراف، ۱۰/۷.
- (8) سبأ، ۱۰/۳۴.

- (۹) الأنبياء، ۸۰/۲۱.
- (۱۰) البيهقي في شعب الإيمان برقم ۱۲۳۲.
- (۱۱) الإصابة في معرفة الصحابة لابن حجر من رواية أنس في سيرة عمر رضي الله عنهما.
- (۱۲) المزمّل، ۲۰/۷۳.
- (۱۳) الخراج لأبي يوسف ص ۱۲۷، المطبعة السلفية، الطبعة الرابعة، ۱۳۹۲ هـ، مع اقتصاديات عصر، صلاح عزام، مجلة منبر الإسلام العدد ۱۲ مارس ۱۹۶۶، مصر، ص ۱۶۳.
- (۱۴) راجع البدائع: ۲۹۹/۵، ردالمختار لابن عابدين: ۱۰۴/۴.
- (۱۵) ۱- رواد البخاري، كتاب البيوع، باب بيع الغرر وحبل الحيلة: ۱۷/۳، ط عيسى الحلي.
- ۲- ومسلم: مسلم ك البيوع باب تحريم بيع حبل الحيلة ورقن ۱۵۱۴، ج ۳، ص ۱۱۵۳.
- ۳- الترمذي، الترمذي ك البيوع باب ما جاء في بيع حبل الحيلة: ۵۲۲/۳، ط مصطفى الحلي.
- ۴- أبو داود ك البيوع باب في بيع الغرر، ۳/۳۴۷، ط السعادة.
- (۱۶) راجع المذاهب: المبسوط للسرخسي: ۱۹۴/۲۱، البدائع: ۱۳۹/۵، ۱۴۸، بداية المجتهد، ۱۴۷/۲، ۱۵۷.
- (۱۷) رواد مسلم: ك البيوع باب بطلان بيع الحصة والبيع الذي في غرر ۱۵۱۳ ج ۳، ص ۱۱۵۳.
- (۱۸) البدائع: ۱۴۷/۵، فتح القدير: ۱۹۶/۵، رد المختار: ۱۱۲/۴، بداية المجتهد: ۱۵۶/۲، المهذب، ۲۶۳/۱.
- (۱۹) المبسوط: ۱۹۴/۱۲.
- (۲۰) الفروق: ۲۶۵/۳.
- (۲۱) المذهب: ۲۶۲/۱.
- (۲۲) المحلي: ۳۹۶۸/۸.
- (۲۳) قد سبق.
- (۲۴) متفق عليه متن البخاري (كتاب البيوع) ۱۹/۲، مسلم، ك. البيوع باب تحريم بيع الحاضر للبادي، ۱۵۳۰ ج ۳ ص ۱۱۵۷.
- (۲۵) متفق عليه، متن البخاري، باب النجش: ۱۷/۲، ط عيسى الحلي، مسلم ك البيوع باب تحريم بيع أخيه وسومه على سومه وتحريم النجش وتحريم التصرية برقم ۱۵۱۶، ج ۳، ص ۱۱۵۶.
- (۲۶) رد المختار: ۵۳/۵.
- (۲۷) ۱- رواد مسلم ك البيوع باب النهي عن المخافلة والزائنة وعن المخابرة وبيع الثمرة قبل بدو صلاحها وعن بيع المعاومة، وهي بيع السنين.
- (۲۸) مالك في الموطأ، كتاب البيوع، باب ما جاء في المخافلة والمزابنة، ۲/۶۲۴، ط عيسى الحلي بمصر.

- راجع لبيع الغرر البدائع: 147/5، رد المختار: 111/4، 114، فتح القدير: 106-161، بداية المجتهد، 151/2.
- (29) الترمذي، كتاب البيوع، ما جاء في النهي عن المحاقلة والمزابنة، 518/3، مصطفى الحلبي بمصر.
- (30) مسلم: ك المساقاة باب تحريم ثمن الكلب وحلوان الكاهن ومهر البغي والنهي عن بيع السنور 1567 ج 3 ص 1198، مالك في الموطأ، ك البيوع باب ما جاء في ثمن الكلب برقم 68، 656/2، ط عيسى الحلبي بمصر.
- (31) المهذب: 261/1، المغني: 251/4.
- (32) البقرة، 276/2.
- (33) المبسوط للسرخسي: 109/12.
- (34) رد المختار: 184/4.
- (35) البقرة، 275/2.
- (36) رواه مسلم عن جابر رضى الله عنه، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله برقم (1598)، 1219/3.
- (37) تفسير الفخر الرازي 14/7، المطبعة المصرية، 1938، الطبعة الأولى.
- (38) د/يوسف القرضاوي "فوائد البنوك هي الربا المحرم" مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى سنة 1993م، بيروت، ص 130.
- (39) آل عمران، 130/3.
- (40) د. يوسف القرضاوي، فوائد البنوك، المرجع السابق ص 88.
- (41) المرجع السابق نفسه.
- (42) د. يوسف القرضاوي، فوائد البنوك، المرجع السابق ص 159.
- (43) التعريفات للجرجاني، ص 49. دار السرور بيروت.
- (44) البخاري مع فتح الباري، 148/6؛ الترمذي كتاب الأحكام باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، 614/3، مصطفى الحلبي بمصر، ولفظه. (لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم... الحديث)، أبوداود، كتاب الأفضية، باب كراهية الرشوة، 409/3 ط. السعادة، أحمد في المسند، 164/2، دار صادر بيروت.
- (45) المائدة، 42/5.
- (46) فتح الباري، 360/5، الحلبي 1959م، البخاري كتاب الإجارة، باب ما يعطي في الرقة، 36/2، ط عيسى الحلبي.
- (47) البقرة، 188/2.
- (48) رد المختار، 362/5، المغني، 78/9.
- (49) نيل الأوطار، 277/8، ط، الحلبي، 1961م.
- (50) مسند الإمام أحمد، 4/3، دار صادر بيروت.

- (51) نيل الأوطار، ٢٧٧/٨.
- (52) المغني، ٧٨/٩.
- (53) المغني، ٧٨-٧٧/٩.
- (54) سيرة عمر بن عبد العزيز لابن الجوزي. دار ابن خلدون إسكندرية، ص ١٤٥.
- (55) المغني، ٧٨، ٧٧/٩.
- (56) أخرجه ابن ماجه، كتاب الأحكام باب من بني في حقه ما يضر جاره ٧٨٤/٢ - ط عيسى الحلبي مصر، مالك في الموطأ: ٧٤٥/٢، كتاب الأقضية باب القضاء في المرفق. ط عيسى الحلبي. أحمد: ٣٢٧/٥، دار صادر بيروت.
- (57) التوبة، ٩٠/٩-٩١.
- (58) رواد الترمذي في الأشربة (باب الروايات المغلظة في شرب الخمر)، ك البيوع، باب النهي: أن تتخذ الخمر خلا ٥٨٠/٣ ط. مصطفى الحلبي، ابن ماجه ك الأشربة باب لعنت الخمر على عشرة أوجه: ١١٢١/٢، ١١٢٢، ط عيسى الباوي بمصر، أحمد في المسند: ٧١/٢، دار صادر بيروت.
- (59) رواد مسلم كتاب الأشربة باب بيان أن كل مسكر خمر وكل خمر حرام ج ٣، ص ١٥٨٨.
- (60) النور، ٣٣/٢٤.
- (61) الإسراء، ٣٢/١٧.
- (62) تفسير الفخر الرازي ج ٢٣/٢٣، المطبعة البهية المصرية، الطبعة الأولى ١٩٣٨م.

THE ARABIC PROPHET - THE MERCIFUL FOR THE WORLD AND THE TEACHER FOR HUMANITY, FROM PERSPECTIVE OF HIS LANGUAGE AND LITERATURE.

الرسول العربي رحمة للعالمين و معلّمًا للإنسانية في منظور لغته و أدبه

عبد الوهاب سلطان عضو رابطة الأدب الإسلامي (الرياض، السعودية)

قاري بدر الدين الأستاذ قسم اللغة العربية بجامعة الأردنو الفيدرالية كراتشي.

ABSTRACT: This article aims to modify the mercy of The Arabic Prophet (صلى الله عليه وسلم) and being a Teacher of humanity from the perspective of his language and literature. It has been pointed out through many witnesses from the Ahadees (Sayings of Beloved Prophet (صلى الله عليه وسلم)) that The Beloved Arabic prophet was sent as mercy and teacher for humanity, not only in his message, but in his language and literature as well.

KEYWORDS: Arab Prophet, Mercy for Mankind, Teacher of Humanity, Language of Prophet, Etiquette of Prophet.

الكلمات المفاتيح: الرسول العربي، رحمة للعالمين، معلّمًا للإنسانية، أدب الرسول العربي (صلى الله عليه وسلم).

الحمد لله الذي رفع قدر العربية، و أعلى شأنها، و أنزل بها ((و أوحينا إليك قرآنا عربيا))، والصلاة والسلام على الرسول العربي، خير من نطق بالضاد، وافتخر بانتسابه إليها وهو سيد الأولين و الآخرين حين قال فيما أخرجه الطبراني في معجمه من حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه: " أنا أفصح العرب، بيد أي من قریش " والذي بُعث رحمة للعالمين. و على آله و صحبه الذين بلغوا رسالته إلى كافة أنحاء العالم بروحها و لغتها و طبيعتها فكانوا بمزاياهم الأدبية و خصائصها العربية خير محل لهذه الرسالة و خير داعية إليها. أما بعد:

مع انبثاق فجر الرسالة المحمدية-على صاحبها الصلاة و السلام- التي بُعثت رحمة للعالمين بدأت مرحلة جديدة في حياة اللغة العربية. فاللغة العربية التي كانت في معظم أدوار العصر الجاهلي تقطر دما، و تتنفس فتكا و قتلا و دمارا، لا تمجد إلا رحما و سيفا، و لا تصف إلا مشاهد قتال و حروب و صراعات طاحنة مستمرة، لا أول و لا آخر -بدأت تستمد اليوم من إشراقة هذه الرسالة النبوية الرحيمة رؤية جديدة ملؤها الرحمة و الإنسانية و الرأفة و العطاء و البذل و البرّ و الكرم و الخلق الكريم و ما يرادف ذلك في قاموس المعاني الإنسانية من كلمات النبل و الكرامة .

اللغة العربية و طبيعتها قبل بعثة الرسول العربي :

أما طبيعة اللغة العصبية و الدموية في عصرها الجاهلي فإن الذي يتابع مسيرة اللغة العربية في عصرها الجاهلي يُدرك ذلك بوضوح و جلاء. و الأمثلة على ذلك كثيرة طفحت بها مكتبة الأدب العربي الجاهلي بأيامه و أخباره، سواء في شعرها و نثرها.

ولقد أحسن العلامة الداعية الأديب أبو الحسن الندوي تصوير المجتمع الجاهلي العصبي الدموي تصويراً قوياً ، يقول: " وكانت العصبية القبلية الدموية شديدة جامحة، و أغرموا بالحرب حتى صارت مسالة لهم و ملهى، و هانت عليهم إراقة الدماء، فتثيرها حادثة تافهة، و تدوم الحرب أربعين سنة، و يقتل فيها ألوف من الناس"¹

ومن هنا يقول أحد الشعراء الجاهليين ما يعكس طبيعتهم المولعة بالحروب و المطبوعة بالغزو و الغارات إلى حد القساوة،

يقول: وأحيانا على بكر أحنينا إذا لم نجد إلا أحنانا

ويقول آخر، و هو عباس بن رأس سلمى في أيام الجاهلية :

فحارب فإن مولاك حارد نصره ففي السيف مولى نصره لا يحارد

ويقول سعد بن مالك الشاعر الجاهلي في تحد و شدة :

كشفت لهم عن ساقها و بدا من الشر الصراح

من صد عن نيرانها فأنا "ابن قيس" لا براح²

هذا قليل من كثير، و من يطالع حروب "البسوس" و "داحس" و "الغبراء" في الأدب العربي الجاهلي يشعر من خلالها و لكأنما الحياة الجاهلية العربية-و كما وصفها العلامة الندوي- " شبكة محبوكة من ترات و ثارات فشت حبالها في القبائل و أوصى بها الآباء الأبناء....حتى كانت كفة الجزيرة كفة حابل لا يدري الإنسان متى يغتال و أين ينهب..."³

فاللغة العربية التي نشأت في ظل هذه العصبية الدموية الغارقة في العدا و القساوة حتى النخاع لم يكن لها بدّ من أن تستلهم منها غير روح القتل و النهب و الفتك و الطمع و الجشع، مع الاعتراف بالمميزات و المحاسن الخلقية الأخرى التي لا يمكن تجاهلها و التهوين من شأنها.

اللغة العربية بعد بعثة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم، رؤية جديدة و مرحلة جديدة:

و عندما أشرقت على هذا المجتمع الجاهلي شمس الرسالة المبعوثة رحمة للعالمين ، -حدثت تغىرات في كل مناحيها، و حتى في طبيعته لغته و أدبه و أساليبه البيانية. فاستلهمت اللغة العربية من وحي هذه الرسالة

المبعوث رحمة للعالمين لغةً التأخي والتراحم والتعاون والتحابب والتسامح والتآلف وكل أنواع التفاعل الإنساني المعروف.

تماما كما صور القرآن الكريم هذا المعنى تصويرا جامعا ورائعا وجميلا حيث قال: {وَأَلَّفَ بَيْنَ فُلُوحِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ فُلُوحِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ} 4
رسالة الرحمة والإنسانية كانت بحاجة إلى لغة الرحمة والإنسانية :

وكان هذا طبيعيا أن يحدث في هذه المنعطف التاريخي العظيم. وكان من البديهي أن تأخذ اللغة العربية هنا طورا جديدا من البيان وتكتسب حلّة جديدة من التعبير. لأن الرسالة التي بعثت رحمة للإنسانية جمعاء كانت بحاجة إلى لغة جديدة تتلاءم مع روحها وطبيعتها وإلى لغة تتناغم مع ذوقها وفطرتها. ولتعبّر عن بعثة الرحمة الإنسانية بأكمل معانيها وأوقافها وأبلغها.

رحلة اللغة العربية مع رسالة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم:

بدأت اللغة العربية رحلتها الجديدة مع الرسالة الإسلامية المحمدية، أضافت إليها هذه الرسالة من خلالها رصيدا لغويا وأديبا من المعاني الإنسانية والمفاهيم الأخوية الكريمة، والمشاعر الرحيمة النبيلة. وضخت في قلبها روحا جديدة تحبّ الأمن والسلام والخير والرحم والوصل وكل ما يخدم مصلحة الإنسان وإنسانيته.

مظاهر الرحمة والتعليم الإنسانية في لغة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم :

المظهر الأول :

تبدأ هذه الرحلة من أول منطلق من منطلقات هذه الرسالة العالمية. عنوان رسالة الرسول العربي المبعوث رحمة للعالمين ينبغي أن يأتي متوافقا مع رسالة رحمته العالمية. فاختارت أبلغ كلمة تعبّر عن معنى الرحمة والإنسانية، لتكونا عنوانا اصطلاحيا لهذه الرسالة. وهي كلمة "الإسلام" فأعظمّ ببلاغتها الرحمية وسموها الإنساني وحدث عن البحر ولا حرج.

حيث تمّ نحتها واشتقاقها من مادة "السلم" أو "السلام". وجرى هذا المعنى في سائر مشتقاتها ودلالاتها. ف"المسلم" يعني الحامل لهذه الرسالة الإنسانية العالمية. وقد أشار القرآن الكريم إلى هذه التسمية بوضوح وبلاغة، قال: {هُوَ سَمَّاكَ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا} 5

كما أوضحها الرسول العربي صلى الله عليه وسلم بوضوح أكثر ولكأنما يلفت أنظار "المسلم" إلى هذه الرسالة الإنسانية "السلامية" -إن صحّ التعبير- التي يحملها اسمه وعنوانه، يقول الرسول العربي صلى الله عليه وسلم فيما أخرجه البخاري في صحيحه عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: ((المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده)) 6

عنوان آخر من عناوين الرحمة والإنسانية في رسالة الرسول العربي:

ويتلو هذا العنوانَ الرئسي لبُعثة الرحمة المحمدية عنوانُ رءىسي آخر في مثل قوته و دلالاته التعبيرية عن محتوى هذه الرسالة التي بُعثت رحمةً وإنسانيةً، و هو كلمة " الإيمان"، وصاحبها " المؤمن". و هو مصطلح إسلامي متعدد الدلات و المعاني و المفاهيم كما ذكرها اللغويون. و لكنها تلتقى جميعاً على مادة " الأمن" التي تم اشتقاق هذا المصطلح منه. و قد ترجم الرسول العربي صلى الله عليه وسلم عن هذا المعنى هو يربط هذا المصطلح بمحتوى رسالته الإنسانية المبعثة رحمةً للعالم، ففيما أخرجه ابن ماجة في سننه عن فضالة بن عبيد أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ((المؤمن من آمنه الناس على أموالهم وأنفسهم))⁷.

وتبرز قوة هذا المصطلح العربي الإسلامي الذي يفرض على حامله-المؤمن- أن يحقق هذا المفهوم عملياً على واقع الأرض في سياق تأكيد و شبه حصري، و بالتالي فإنه يوحي أن الذي لا يأمنه الناس على أموالهم و أنفسهم لا يحقق له أن يتسمّى بـ " المؤمن".

اهتمام الرسول العربي بإثراء اللغة رحمةً وإنسانيةً:

وهكذا و بهذا الاهتمام البياني الرائع بدأ الرسول العربي صلى الله عليه وسلم يُضَيِّف إلى رصيد اللغة العربية منذ انطلاقة رسالته الأولى ثروة لغوية ضافية تعبّر عن مفاهيم الرحمة الإنسانية التي اختصت بها في عناوينها الرئيسية التي اصطلحت رسالة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم عليها، لتطلع على العالم رافعة راية السّلام و هتاف الأمن.

توظيف البُعد الإنساني في اللغة عند الرسول العربي صلى الله عليه وسلم:

ولا يدور اهتمام الرسول العربي صلى الله عليه وسلم في فلك المصطلح الإسلامي فحسب بل يعدوه إلى عامة مظاهر اللغة العربية و أسمائها و دلالاتها الشائعة في المجتمع الإسلامي. و نجد في أحاديثه صلى الله عليه وسلم أمثلة و نماذج رائعة تمثل عنايته صلى الله عليه وسلم بتغيير الأسماء و العناوين و الأمثال و المصطلحات و يستبدل لها بدائل أخرى هي أقرب إلى معاني الرحمة و الإنسانية التي تكوّنت منها حمة رسالته صلى الله عليه وسلم و أكثر دلالة على هذا البُعد الإنساني النبيل الذي يبعث التفاهل و يبشّر بالخير و يحفّز على الكرم و العطاء.

المظهر الثاني من مظاهر الرحمة و تعليم الإنسانية في لغة الرسول العربي:

منها-على سبيل المثال- تسمية " يثرب" بـ " المدينة" المنورة. حيث أخرج البخاري في صحيحه فيما رواه أبوهريرة - رضي الله عنه - يقول قال رسول الله: ((أمرت بقرية تاكل القرى يقولون يثرب وهي المدينة تنفي الناس كما ينفي الكبر خبث الحديد))⁸

وهو في الواقع تغيير عميق يتصل أحد طرفيه بزمام اللغة العربية و ثانيه بزمام النفسية الإنسانية التي تتأثر بطبيعتها من دلالات الأسماء. فلما كانت كلمة " يثرب" على عربيّتها تحمل شُمة من معاني الشر و الهلاك، و

كان من الطبيعي تأثر النفوس الإنسانية بهذا الاسم، أزالها الرسول العربي صلى الله عليه وسلم من قاموس اللغة العربية الإسلامي.

وأحل محلها كلمة ذات دلالة راقية و شاملة لعدة أبعاد لغوية و أدبية وثقافية تجعلها أقرب إلى البعثة الحمديّة و أشمل دلالة على محتواها. فكلمة " المدينة" فضلا عن دلالتها اللغوية الصادقة و المطابقة لمدلولها، تحمل أبعادا أعمق منها، وهي أبعاد " المدينة" و " التمدن" و " التعايش المدني" و ما إليه، و التي تنتحلها اليوم الجهات التي تسمى فيما تسمى " الدول المتقدمة" و " الراقية" و " الحضارية" لحين أن الرسالة الحمديّة هي التي أرست دعائمها منذ أول يومها حتى سّمت معسكر رسالتها الأول باسم " المدينة" إحياء بهذا المعنى الإنساني العظيم.

نموذج آخر في هذا السياق:

وتأتي في هذا السياق كلمة أخرى لتسمية هذا المركز الإسلامي الأول الذي انطلقت من الرسالة الحمديّة. و نجد في بعض الروايات ما يدلّ كيف أن الرسول العربي صلى الله عليه وسلم يختار لها من الكلمات أفضلها و أجملها و أطيبها، و هي كلمة " طابة" لتضفي على مدلولها معنى إنسانيا لطيفا يتفق و طبيعة رسالته المبعوثة رحمة للعالم بلغتها و أدبها فضلا عن مدلولها و محتواها.

ففي ما أخرجه البخاري في صحيحه عن عن أبي حميد - رضي الله عنه - : ((أقبلنا مع النبي من تبوك حتى أشرفنا على المدينة فقال هذه طابة (طابة))⁹

أثر هذا التغيير على لغة المجتمع:

ولم يكن ذلك مجرد تعبير عن شعوره. بل أخذت هذه الدلالات الجديدة رواجاً في لغة المدينة المنورة و أدب أهلها. و جرت في شعرها و نثرها مجرى سائر الكلمات.

ومن ثم نجد ذات الكلمة عند أحد شعراء الصحابة رضي الله عنهم و هو يستخدمها في بعض أبياته عن دعوة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم كأنها هي الكلمة المعروفة بينهم، حيث يقول فيها: فلمّا أتانا و استقرّت به النوى و أصبح مسرورا ب" طيبة" راضيا¹⁰ يعني ب" طيبة" المدينة المنورة.

المظهر الثالث من مظاهر الرحمة و الإنسانية في لغة الرسول العربي صلى الله عليه وسلم:

ونجد ثمة مظهرا ثالثا من مظاهر هذا الإصلاح اللغوي في كتب السنة و السيرة و الذي يهدف إلى توظيف المعنى الإيجابي الإنساني في الكلمات العربية. و هو يتمثل في إحلال كلمة " العشاء" محلّ كلمة " العتمة". فقد كان العرب الأنصار قبل الهجرة يستعملون " العتمة" للعشاء. و كانت تحمل رائحة سلبية لدلالاتها على " الظلمة" و " الظلام". فاستبدلها الرسول العربي صلى الله عليه وسلم بكلمة " العشاء".

ولا زالت هذه الأخيرة هي الكلمة التي يستعملها العرب المسلمون و غيرهم للتعبير عن معنى " العتمة" السابق. و لنقرأ القصة بلفظها فيما أخرجها المسلم في صحيحه عن بن عمر قال "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم * لا تغلبنكم الأعراب على اسم صلاتكم العشاء فإنها في كتاب الله العشاء وإنها تعتم بحلاب الإبل"¹¹ ويتجلى فيه اهتمام الرسول العربي صلى الله عليه وسلم الكبير باتخاذ المصطلح الإسلامي الإيجابي، حيث نوّه باستخدام كلمة "العشاء"، و حذّر في الوقت نفسه من أن تغلبهم لغة الأعراب السلبية في خصوص هذه الكلمة.

أثر الوحي السماوي في الإصلاح اللغوي :

وبحكم كون اللغة العربية لغة رسمية في السماء-إن صح التعبير- فإن هذه التغييرات الإيجابية لتأصيل المصطلح الإسلامي كانت تتم في السماوات و منها تأتي إلى الأرض. و قد ورد في بعض الروايات الحديثية ما يعزوا هذه التسمية إلى الله سبحانه و تعالى.

ففيما جاء في " مشكل الآثار" للإمام الطحاوي (م321هـ) رحمه الله تعالى ما يعزّز هذا الاتجاه كالتالي : "الأمر الذي كانت العرب تعرفه في اسم هذه الصلاة أنه العتمة لا العشاء، وكان السبب في تسميتها إياها ذلك الاسم ما قد ذكر في حديث أبي سلمة عن ابن عمر الذي ذكرناه في أول هذا الباب حتى أنزل الله عز وجل على رسوله:

{ يا أيها الذين آمنوا ليستأذنكم الذين ملكت أيمانكم والذين لم يبلغوا الحلم منكم ثلاث مرات من قبل صلاة الفجر وحين تضعون ثيابكم من الظهيرة ومن بعد صلاة العشاء ثلاث عورات لكم } [النور: 58] فصاروا إلى اسمها الذي سماها الله عز وجل به في هذه الآية، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم"¹² إشكالية و الإجابة عنها:

وهنا تظهر إشكالية ربما تفرض نفسها على الذهن ، و مفادها أنا نجد حتى في صميم الشعر العربي الإسلامي ما يفيض حربا و حماسا، و يشعّ قتلا و جهادا. فقد كان عند الشعراء الإسلاميين في العصر الإسلامي من أمثال حسان بن ثابت و كعب بن مالك و عبد الله بن رواحة رضي الله عنهم أشعار قوية حماسية لمقارعة شعراء المشركين. و لكن هذه الإشكالية لا تصح في هذا المقام. فإنهم في واقع الأمر لم يقولوها ليدافعوا عن أنفسهم أذى فرديا نالهم من المشركين بل ليدفعوا عن المجتمع الإسلامي الفتي الناشئ إيذاء المشركين و افتراءاتهم.

وهنا كانت اللغة العربية هي الأخرى تجلت في صيغتها الشعرية لتجسّد مفهوم التراحم و التلاحم و التناصر الذي دعا إليه الرسول العربي صلى الله عليه وسلم فيما أخرجها المسلم في صحيحه عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

((المسلمون كرجل واحد إن اشتكى عينه اشتكى كله وإن اشتكى رأسه اشتكى كله))¹³

كلمة الختام :

و قد تبلورت من خلال النماذج و الأمثلة المذكورة أعلاها و ما عداها مما توارد في كتب السنة و السيرة شذّر مذر أن اللغة العربية كانت موضع اهتمام خاص للرسول العربي صلى الله عليه وسلم. و فضلا عن جوامع كلمه و سنته و أحاديثه و خطبه العربية الخالدة شبه المعجزة التي كانت و ظلت و لا تزال عمادا أساسيا للأدب العربي الإسلامي فقد كان يخدمها و يثري مادّتها بتحريّ البدائل العربية التي تخدم مصلحتها بشكل أفضل. و غالبا ما تغلب على هذه الاستعمالات العربية البديلة التي وضعها الرسول العربي صلى الله عليه وسلم طابع الرحمة و سمة الإنسانية. و بالتالي تترقق من خلالها شخصية رسول عربي بعث رحمة للعالمين و معلّما للإنسانية ليس برسائلته و دعوته فحسب، بل بلغته و أدبه كذلك.

الهوامش:

¹ أبو الحسن علي الندوي، السيرة النبوية، للعلامة أبي الحسن الندوي، ص: ٤٠، المطبعة العصرية للطباعة و النشر، لبنان، بيروت، رقم

الطبعة غير متوفر

² ديوان الحماسة في الشعر الجاهلي

³ أبو الحسن الندوي، ماذا خسر العالم بالخطأ المسلمين، ص: ٦٢، مكتبة الأيمان، مصر، رقم الطبعة غير متوفر

⁴ القرآن الكريم، [الأنفال: 63]

⁵ القرآن الكريم، [الحج: 78]

⁶ صحيح البخاري-نسخة طوق النجاة - (1 / 13)

⁷ سنن ابن ماجه - (2 / 1298)

⁸ صحيح البخاري-نسخة طوق النجاة - (1 / 13)

⁹ صحيح البخاري-نسخة طوق النجاة - (1 / 44)، باب المدينة طابة (طابة)

¹⁰ حياة الصحابة للعلامة يوسف الكاندهلوي رحمه الله تعالى

¹¹ صحيح مسلم - عبد الباقي - (1 / 445)

¹² شرح مشكل الآثار - (3 / 30)، الإمام أبو جعفر الطحاوي، طبع مؤسسة الرسالة مصر. الطبعة الأولى (1415 هـ ، 1494 م)

¹³ صحيح مسلم - موافق لترقيم عبد الباقي - (4 / 2000)

LEADERSHIP TRAITS-AN ISLAIMIC PERSPECTIVE

Nasir Majeed

Hafiz Muneer Ahmed Khan

ABSTRACT: *Great leadership is unique form of art, requiring both force and vision to an extraordinary degree. The attribute of leadership has been sought far more than any other attribute. Some view it as a gifted quality while others see it as an art that can be acquired. History provides ample examples to see the effects of leadership and that of great leaders, not only on battle field but also at the national level. The importance and requirement of an effective leadership has increased manifold considering the modern and perceived future battle fields. It is believed, that future battles are going to be technology intensive, short lived requiring quick decision making, more lethal and with an enhanced canvas that would not only include conventional but unconventional means as well. Coupled with such a battle field, threats confronted to national security will also be complex and more dangerous. To counter such an environment, the leadership should be equally strong enough to effectively take on these challenges. Notwithstanding the challenges of present or future, the basic principle for any leader remains to be that he must have a great vision, strong enough to inspire others to follow him. The fundamental quality of leadership to inspire others can be applied at any level, starting from a group of few individuals to complete nation. Being Muslims, we believe that Islam is a code of life encompassing every aspect through fundamental sources of Quran and Sunnah and this should, in principle, include leadership aspect as well. It is, therefore, imperative to view this important subject from Islamic perspective and find out how it addresses modern day challenges. This paper discusses the Islamic concept of leadership and essential leadership traits as espoused by the teachings of Quran and Sunnah.*

Keywords: *Leadership, Islamic Leadership, Leader qualities in Islam, Muslim Leader.*

Definition and Concept of Leadership

A variety of definitions of Leadership can be traced from the books and quotes of different leaders and thinkers. Two such definitions are being covered here to set the foundation for further discussion: -

Leadership is depicted as the "process by which the leader seeks the voluntary participation of followers in an effort to reach organizational objectives". This definition stresses upon voluntary participation without any forced change. The followers must share and understand the leader's vision with conviction and clarity.

Second definition of leadership distinguishes it from the more routine processes

associated with management: -

Leadership is the ability to persuade others to seek defined objectives enthusiastically. It is the human factor which binds a group together and motivates it toward goals. Management activities such as planning, organizing, decision making are dormant cocoons until the leader triggers the power of motivation in people and guides them toward their goals.

The above definition of leadership stresses that a leader is more than just a manager. Leading and managing are not the same things. Warren Bennis, a leadership expert, summarizes the distinction between leadership and management as follows: -

"The difference between managers and leaders is fundamental. The manager administers, the leader innovates. The manager maintains, the leader develops. The manager relies on systems; the leader relies on people. The manager counts on control; the leader counts on trust. The manager does things right, the leader does the right thing.

Concept of Right and Wrong Leaders

The central idea of leadership definitions remains quality of a leader to inspire his followers for the task or goal he has set forth. Task or goal can either be positive or negative, in other words right or wrong. When we discuss the leadership aspect in the light of Quran, it becomes evident that Quran lays clear distinction for everything i.e. it is either right or wrong, where right is the virtue and wrong is evil. Same holds good for leadership as well. Right leaders lead their nation to ultimate success and wrong leaders lead their people to ultimate failure. Successful people in the light of Quran are those who will be given the reward of paradise. Allah (SWT) mentions in the Quran: -

"The people of Hell and the people of Paradise are not equal. The people of Paradise are the successful. "(59:20)

At another place Allah (SWT) mentions the ultimate success as seeking His pleasure. He says in the Quran: -

"Allah has promised to the believers, male and female, gardens beneath which rivers flow, where they shall live forever, and good homes in gardens of eternity. And Allah's pleasure is above all. That is the supreme success." (9:72)

Quran gives examples of right and wrong leaders to draw pertinent lessons. Quran mentions the story of Prophet Musa (PBUH) and Pharaoh in detail and at many

places. Pharaoh a leader and king of Egypt eventually led his nation to doom and destruction i.e. into hell fire on the Day of Judgment. Allah (SWT) mentions in Quran: -

"And We sent Musa, with Our signs and with clear proof, to Pharaoh and his group. So, they followed the command of Pharaoh, while the command of Pharaoh was not right. He will lead his people on the Day of Judgment, and make them descend into Fire. And it is the evil descending place." (11:96-98)

On the contrary Quran also gives examples of right and successful leaders. Quran says while mentioning the story of Prophet Ibrahim (PBUH):-

"When his Lord put Ibrahim to a test with certain Words, and he fulfilled them, He said, "I am going to make you an Imam for the people." He said, "And from among my progeny?" He replied, My promise does not extend to the unjust." (2:124)

Islamic Concept of Leadership

Having established the concept of right and wrong leaders, let us see what Islam offers us as the concept of leadership through its two major sources i.e. Quran and Sunnah of Prophet Muhammad (PBUH). Quran identifies leadership as a sacred trust which should be given to those who are deserving or capable of holding it. Quran says: -

"Surely Allah commands you to deliver trusts to those entitled to them, and that when you judge between people, judge with justice. Surely, excellent is the exhortation Allah gives you. Surely, Allah is All-Hearing, All-Seeing." (4:58)

Similarly, Prophet Muhammad (PBUH) has described everyone to be a leader in whatever capacity he is. He says in one of the narrations: -

"Every one of you is a shepherd and is responsible for his flock. The leader of people is a guardian and is responsible for his subjects. A man is the guardian of his family and he is responsible for them. A woman is the guardian of her husband's home and children and she is responsible for them. The servant of a man is a guardian of the property of his master and he is responsible for it. Surely, every one of you is a shepherd and responsible for his flock."

Two important cardinals emerge from above mentioned references, i.e. leadership is a sacred trust that should be given to the capable or deserving one and that everyone is entrusted with the responsibility of being a leader in some capacity. And what is

desired of a leader is that he will obey Allah and His Messenger in all his matters. Quran mentions: -

"Say, Obey Allah and obey the messenger..." (24:54)

Attributes of a Muslim Leader

After discerning the concept of leadership in its broad terms, an endeavor has been made herein to identify certain key characteristics of a Muslim Leader. Dr. Allama Iqbal regards a Muslim Leader to be of high value both in mundane and spiritual aspects. He says: -

Nighe Buland, Sukhan Dilnawaz, Jaan Pursoz

Yehi hae rakht e safar meer e karwaan ke liye

Translation: -

High ambition, winsome speech, a passionate soul

This is the entire gear for the leader of a Caravan

Following are few of the attributes: -

• **Taqwa.** The foremost requirement in a Muslim Leader after his faith is his 'taqwa' or God Fearing attribute. Allah (SWT) has laid much emphasis on this important attribute for all the Muslims and for a leader it has to be much greater than others. Allah (SWT) says in Quran: -

"Whoever obeys Allah and His messenger and has awe of Him and observes Taqwa for His sake, then such people are the victorious." (24:52)

At another place Allah (SWT) says: -

"Surely the noblest of you, in Allah's sight, is the one who is most pious of you. Surely, Allah is All-Knowing, All-Aware." (49:13)

Taqwa enables a person to be God conscious and he is aware that every action is being watched and gauged accordingly. It urges a Muslim Leader to carry out his accountability and make necessary corrections accordingly. A Muslim Leader with such a precious attribute will invoke Allah's Blessings and help in all his efforts that will make him victorious as highlighted in above mentioned verse.

Knowledge. Another very important attribute that a Muslim Leader must possess is his knowledge of both mundane as well as religious subjects. This attribute will enable him to lead his followers effectively. Given the rapidly changing battle field

and its related complexities, a leader with a thorough knowledge of latest developments will only be able to lead his men successfully. Quran again guides us on this important leadership trait through an example of Bani Israel and their demand to a Prophet of their times to make dua to Allah, the Almighty for appointing a king or leader for them under whose leadership they could fight. The Prophet then tells that Allah (SWT) has selected Talut as a king for them. They objected on his leadership because he was not wealthy. Prophet told them that wealth was not a criterion in choice of leadership. He told them Talut deserved to be a king because he was having knowledge and power. The incident has been described in the following manner: -

"Did you not see a group from the children of Israel after Musa when they said to their prophet: Appoint for us a king, so that we may fight in the way of Allah...Their prophet said to them: Allah has appointed Talut as a king for you. They said: How could he have kingship over us when we are more entitled to the kingship than him? He has not been given affluence in wealth. He said: Allah has chosen him over you and has increased his stature in knowledge and physique, and Allah gives His kingship to whom He wills. Allah is All-Embracing, All-Knowing." (2:246-247)

Thus knowledge and his physique or power enabled Talut to be a chosen leader over others. A reflection over message of Quran reveals that there exists a very strong linkage between knowledgeable and God Fearing people as described in Quran: -

"Only those of His slaves fear Allah who are knowledgeable" (35:28)

The attribute of knowledge has a very close relevance to present day's environment specially once seen the complexion and diversity of security threats confronting the country. Knowledge will guide the leader to the right path or direction enabling him to correctly comprehend a situation and accordingly take correct decision. The physique or power enables him to be mentally, psychologically and physically strong enough to bear and face the challenges audaciously.

Justice. Another important facet of a Muslim Leader's personality is his capability to deliver justice even against heavy odds. Injustice leads to inequality thus affecting the motivation of men for undertaking any assignment. Allah (SWT) has laid much emphasis on this aspect in Quran. He says; -

"Surely, Allah commands you to deliver trusts to those entitled to them, and that, when you judge between people, judge with justice." (4:58)

Even the prophets were also guided and told the importance of this important aspect

of leadership. In an incident of Prophet Dawood (PBUH), Allah (SWT) mentions in Quran that he gave a decision in favor of first party without listening to the opinion of the other party in one of the disputes. Allah (SWT) corrected Dawood (PBUH) at that point and guided him that he should listen to the opinion of second party in future as well. Prophet Muhammad (PBUH) was also very conscious and uncompromising in the aspect of delivering justice. His action of not changing his decision in the case of a woman belonging to an affluent tribe caught in a theft case despite efforts of intercession is a known example. However, his reply to the interceder in that case is a beacon for the leaders of all times. This has been reported upon in the words as under:

"When it was dusk, Allah's Messenger (PBUH) stood up and gave an address. He first glorified Allah as He deserves, and then said: This injustice (intercession in favor of a thief) destroyed those before you that when anyone of high rank committed theft among them, they spared him, and when any weak one among them committed theft, they inflicted the prescribed punishment upon him. "

All above mentioned exam-pies clearly emphasize the importance of justice that a leader must be able to deliver while dealing with his men. Dispensation of justice has a dual effect in a way that it, on one hand increases the confidence of men in their leader for getting their rights and on the other hand, it creates the desired deterrence in a society against crimes. Men will willingly follow a leader who is just in his dealings.

Compassion. Another important attribute that Islam lays emphasis on, is the compassion or kind heartedness of a leader. Though, it may sound strange to many given the experience and exploitation of such a quality of any leader by the under command. But the reality is that compassion fetches those dividends which are not possible, otherwise. Quran again provides us insight into this important character trait of any leader. While discussing the kindheartedness of Prophet Muhammad (PBUH), Allah (SWT) mentions in Quran; -

"And We have not sent you but as mercy for all the worlds."(21:107)

At another place in Quran it has been mentioned that Prophet's kindness was a binding factor for his companions. Allah (SWT) mentions as follows: -

"So, (O Prophet) it is through mercy from Allah that you are gentle to them. Had you been rough and hard-hearted, they would have dispersed from around you. "(3:159)

The afore mentioned verse is a clear testimony to the fact that Prophet's (PBUH) kind heartedness kept the people together and this produced such results which no one

could have ever imagined in those times.

Tawakkul. A leader must place all his trust in Allah's help and should know it clearly that without Allah's help, he will not be able to achieve any glory. However, one must keep in mind that tawakkul involves complete preparation for the task or battle followed by placing trust in Allah. One must not get a wrong and misconstrued meaning of tawakkul that it is synonymous to inactivity or complacency with reliance only on dua. Quran again guides us unto this important leadership trait as under: -

"Consult them in the matter and, once you have taken a decision, place your trust in Allah. Surely, Allah loves those who place trust in Him."(3:159)

A practical example of tawakkul is the Battle of Badr, where Prophet Muhammad (PBUH) after making all preparations for war, made supplication for invoking Allah's help. It has been narrated by Ibn e Abbas that: -

"On the day of Battle of Badr, the Prophet said, O Allah! I appeal to You (to fulfill) Your Covenant and Promise... "

Hence, a leader must know the true meaning of tawakkul and know how to invoke Allah's help in the times of trepidation.

Bravery. A leader has to be brave and mentally strong. The opposite version is simply unacceptable. If we look at the personality of Prophet Muhammad (PBUH) we find that he was the bravest of his times. It has been reported upon by Ali (may Allah be pleased with him) that: -

" Whenever the fight grew fierce and the eyes of fighters went red, we used to resort to the Prophet (PBUH) for succor. He was always the closest to the enemy."

Conclusion: While modern and future security environment is perceived to be much more complex, lethal, demanding and challenging for leaders at all tiers; the message of Islam and Quran provides a wholesome solution to this situation. Attributes appended in this article are just a few, many more can be reflected upon through the study of Quran and Sunnah. It is always easy and more beneficial to study a model that provides a wholesome picture of all such attributes and we can find such a model in the personality of Prophet Muhammad (PBUH). By studying his personality and his life leaders at all tiers can get true guidance and practical manifestation of Quran injunctions. As has been described by Allah (SWT) in Quran: -

"There is indeed a good model for you in the Messenger of Allah for the one who has hope in Allah and the Last Day and remembers Allah profusely," (33:21)

ENDNOTES

1. Richard Nixon, *Leaders*, 1982, Chapter 1, p.4.
2. Schriesheim, C. A., Tolliver, J. M. and Behling, O.C. (1978). Leadership theory: Some implications for Managers. *MSU Topics, Summer* (26); 35.
3. Davis, K. (1967), *Human Relations at Work: The Dynamics of Organizational Behavior*. New York: McGraw-Hill, p. 96.
4. Bennis, Warren. *Fortune* (1988). January.
5. Justice Mufti Taqi Usmani, English Translation Quran e Karim.
6. Sahih Bukhari, narration 6719, Sahib Muslim, narration 1829.
7. Allama, Iqbal, Bal e Jibril
8. Sahih Muslim: Book 17, Hadith 4188.
9. Sahih Bukhari: Book 59, Hadith 289
10. Safi ur Rehman Mubarak Puri, *The Sealed Nectar*, 1996, p. 497

THE ORIGIN, DEVELOPMENT AND IMPORTANCE OF ALTERNATIVE DISPUTE RESOLUTION MECHANISM IN THE LIGHT OF ISLAMIC INTERPRETATION

Abdullah Jumani, Research Scholar, Faculty of Law, University of Karachi.

Saeed Ahmed, Associate Professor Department of Law, Federal Urdu University, Karachi.

ABSTRACT: Islam is the religion of peace that gives prime importance to equality and justice. It is evident from the known human history that peace is the byproduct of these two concepts. Every culture and society has some laws and procedures to maintain peace within its fold. Litigation is the standard method to restore peace in any community but it is believed to be lengthy and costly mechanisms that most people avoid accept in cases where the state laws have been violated. The second easiest and viable method is arbitration to prevent violence at domestic level between the disputants. Islamic tradition has a long history of arbitration and amicable conflict resolution (*sulh*) which has also its roots in pre-Islamic Arabia. The Quran clearly directs in *surh-al-Hujraat* its adherers to make *sulh* between two sides when the groups of believers fall to fighting. If one of them outrages against the other, then the Muslims should fight against the one, who outrages till it complies with the command of Allah and then, make reconciliation between them justly. In this paper, general and Islamic historical background of Alternative Dispute Resolution (ADR) process is explored with the help of Islamic exegeses and the Prophet's biography. Our findings reveal that ADR is a much easier and practical solution in disputes settlement for it takes less time, accessible to everyone and costs nothing than the traditional court procedure is required in litigation.

Keywords: *sulh, Arbitration, Alternative, Dispute, Resolution, Litigation, Compensation*

INTRODUCTION

Globalization and technology have greatly affected the people's life style and behavior at the same time. Due to poor health and economic conditions, influx of common masses has been relocating in cities from small towns and villages. As a result, these cities have been immensely populated with the inhabitants belong to different religious ideologies and cultures. Sometime their interaction in different

fields of life instigates conflicts. Usually it is not viable to take every issue to the court of justice and settle it there. There may be several social and economic reasons for not taking the rout of formal legal system, as it might be lengthy and costly. All those factors involved in formal judicial system have given rise to alternative dispute resolution (ADR).

ORIGIN OF ALTERNATIVE DISPUTE RESOLUTION (ADR)

It is not a new phenomenon in the twentieth century but a very well know system from ancient times adopted by old civilizations. ADR is a type of arbitration between two individuals, groups or institutions. Mutual agreement of both the litigants is the prerequisite for employing this system in certain cases that do not come directly under the prescribed laws of the state. Alternative Dispute Resolution (ADR), also known as external dispute resolution in some quarters, is a dispute resolution procedure that works as a mechanism for the conflicting parties to come to an agreement without formal litigation¹. It provides an opportunity to the disputants to solve their disagreements with the help of third party or without it. It is also described as an alternative course of action contrary to standard legal court procedure.

The conventional courts have already been burdened with rising numbers of cases, which has automatically triggered the popularity of ADR in the modern days. In another words, excessive delay of cases in the traditional courts have also confirmed the very fact that “justice delayed is justice denied”. Due to a widespread perception that ADR requires less cost and time than traditional courts require, the involved parties prefer to have their trust in such individuals who will decide their disputes.² It is not a novel phenomenon; during the recent years the ADR has gained a widespread acceptance among the common masses.

The main components of ADR are explained as:

- Arbitration
- Mediation
- Conciliation

- Negotiation

DEVELOPMENT AND IMPORTANCE OF ADR

The first known historical account of ADR could be traced back to China in the teachings of Confucian ethics. He says that adversarial proceedings are the reversal of natural harmony that should be protected to maintain peace in the society. Important thing is that Chinese form of mediation not only aims to resolve the conflict when it occurs but to prevent it from taking place. It is a quality management of conflict resolution and Chinese mediators treat a conflict as something evil or bad that must be solved. The similar phenomenon is seen in Chinese traditional term for a mediator *shuo he ze* who uses harmonious language to appease the disputants and to smooth the interpersonal relationship between them. He is like an educator and counselor in the Chinese culture².

Similar to Chinese culture, arbitration has also found in Greek and Roman civilizations. To settle disputes in ancient Greece, the only purpose was to avoid unsettling differences between the two parties. The reciprocity principle didn't make peaceful resolution of conflicts. The use of mandatory rational mediation written in Herodotus' report describes that the Persian Empire imposed arbitration procedures on the Ionian cities to settle their differences. Xenophon points out a case where Persians pushed the Armenians and Chaldeans to reach an agreement about unused land and thus creating win-win situation. Regarding another case Xenophon has reported that the cases of involuntary exchange aren't just³.

THE CONCEPT OF ADR IN PRE-ISLAMIC ERA

Arbitration and dispute resolution (*sulh*) have a long history within pre-Islamic era in Arabian Peninsula. Largely the tribes who claimed to descend from common ancestor inhabited the peninsula. Every tribal individual owed allegiance to his relevant tribe as whole, which was responsible to protect the social and economic interests of that person. The tribes were bound by a set of unwritten rules, which had evolved alongside historical development of that tribe itself as an expression of its power and

influence. Nobody had the legislative authority to intervene in this system which also lacked official and legal organization. Law enforcement was generally, the responsibility of the parties which were involved in the disputes. The internal disputes of the tribe were administered by the chief of the tribe in a manner, which suited to tribal culture that rested widely on arbitration and conciliation⁴. The tribal justice system was based on two fundamental rules: (1) the principle of collective responsibility; and (2) the principle of retribution or compensation. The focus of tribal laws was dual simultaneously: to punish the aggressor and to restore the balance among the offender, the victim and the relevant tribes at the same time⁵.

Reconciliation (*sulh*) or peacemaking has been an ancient practice started before the commencement of Islam. Within the Arab tribal society, the chiefs (*sheikhs*), soothsayers and prominent individuals used to settle disputes between the disputants within a tribe or between competing tribes. The influence and prestige of those men served as bounding force to implement their decisions on the conflicting parties⁶. Their decisions were thought to be final but legally to any standard. It was a reliable statement about customary law. The main objective of these third parties was to maintain peace and harmony in the tribal society. Some mediators (*hakam*) would even surrender themselves in front of the disputants that they produced the necessary compensation or incentive from their own pockets to persuade the conflicting parties and bring them to *sulh*⁷.

From an early age, the tribesmen were socially oriented to seek help from their leaders to solve their mutual conflicts. There was existed a hierarchal system of arbitration. In a family, the father as the head of the family was thought to be the final authority to solve their internal and domestic issues. A youngster sought his father's arbitration to resolve issues between him and his family members or relatives. Thus, the father was the mediator (*wasta*) between his family member and other relatives. As a child grows, he also began referring to the elders of his family such as uncles or cousins, so everyone used to help each other. Similarly, in crises or critical situations,

they relied heavily on their fellow tribesmen. They knew the significance of arbitration very well. However, in more complex and serious conflicts they contacted to their sheikh who used to be an influential and wise person of that tribe.

The Arabic word "*wasta*" literally means "the middle" and it is associated with the verb *yatawassat*, which means to bring the two disputant parties to a middle point or reconciliation. The word "*wasta*" indicates both: a person who provides mediation and second, the act of mediation⁸. Since its inception, the use of *wasta* has been a basic institution and element of Arab society. Its tribal function centers on a mediator who tries to avoid reprisals in inter-personal or inter-group relationships⁹.

Tribal customs and administrative procedures provide a unique mechanism to effectively contain and resolve conflicts within the tribal boundaries. The idea of collective responsibility extended from a tribal family to a clan that equally ensures the security of all its members¹⁰. However, the notion of collective responsibility works like a double-edged sword. A trivial fight between the two individuals can draw their families and relevant tribes into a bloody war or contrary to it, the fear of a serious clash would stop them to indulge in a dispute. At the same time, when a tribesman commits a crime, the phenomenon of collective responsibility facilitates the rapid settlement to the victims' family for the offender's tribe is responsible to pay the penalty. As the cash or other kind of compensation is the chief source of settlement in tribal disputes, the arbiters can gain a lot of prestige if their intervention and mediation result in the settlement of that dispute peacefully.

In tribal culture, an individual is like a microcosm of a collective life; hence, both are considered identical to each other. An aggression on any individual is deemed an attack on the entire clan and vice versa. Any revenge or compensation towards the victim against the offender is declared a demand against the tribe as a whole, not just against the offender alone. The wrongdoer's tribe pays the money to victim's family from their collective resources. The whole tribe is held responsible collectively for the punishment, revenge or penalty money.

The selection of a *hakam* or arbiter was based on his personal reputation, prestige or belonging to a family known for its decision-making skills or supernatural powers. A priest belonged to a pagan cult who claimed his allegiance with divine powers was their popular choice. Often the disputed parties tested arbiter's claim of being sacred beforehand. If the arbiter showed his willingness to settle their dispute, each side was required to provide a security bond in the form of goods or hostages. The disputant groups were also liable to provide guarantee that they would respect referee's judgment as final verdict and bound to accept the true declaration on the disputed issue¹¹. The application of the arbitral judgment depends entirely on the credibility of the mediator and his status in the tribal society. Most referees used persuasive language to give the impression that the decision was rightly proposed under the given conditions and well-suited for both the parties¹².

To validate the process of arbitration, it was necessary for both the side to attend the hearing, which relied on the plaintiff who was to prove his case, and the accused was bound to take an oath in his defense¹³. If the applicant failed to prove his case then the arbitrator asked the accused to take an oath to dismiss the prosecution. Before the advent of Islam, the tribes of Makkah took their oath before the statue of Hubble (an idol) fixed in the *kaba* in Mecca.

Once before the assignment of messenger-ship the Prophet Muhammad ﷺ was selected to settle the dispute on the fixing of Black stone in the wall of *kaba*. As famous for his truthfulness and reliability, sometimes he was also described as *kahin*. At that time, a sharp disagreement occurred among the tribes over the reinstatement of the Black stone in *kaba*. Every chieftain desired to honour this duty alone but failed to seek an agreeable solution. The Prophet ﷺ resolved the issue by placing the stone in the middle of his robe and asked all the chiefs to hold the corner of it. Then he himself placed the stone in the corner of the wall and everyone accepted his solution gladly.

In some parts of the Arab world, conflict settlement was relatively organized and durable. "The general picture of primitive martial traditions tribal law in the Arabian Peninsula required certain qualifications"¹⁴. For example, Mecca, was a thriving trade market with a rudimentary system of administration where public arbitrators were placed who applied some sort of commercial law to settle disputes among traders. On the other hand, Medina was an agricultural region with a basic administration of justice and some forms of land tenure. However, in both the cities customary practice was the only source of legal system¹⁵. Later Islam also permitted its adherers to continue the previous trends which ensured peaceful solution to different disputes. The custom or *urf* is also a verified rule and legitimate source of law in the Islamic jurisprudence which allows to exercise customary practices, as long as, they do not conflict with Islamic law and tradition¹⁶.

Islam kept honored many of the rules of conduct, which practiced before the advent of Islam, especially customs related to personal honor, hospitality and courage. The Prophet ﷺ also supported values such as kindness, mercy and justice that cultivated the customs and practices of the ancient region. The Prophet's moral teachings are summed up in a tradition attributed to him; he stated that he was "sent to promote principles of good character"¹⁷. Many positive tribal customary practices have been incorporated into Islamic jurisprudence and culture.

MECHNISM OF “ADR” IN RELATION TO ISLAMIC INTERPRETATION

Throughout its history, Islam has always emphasized on the concept of *sulh* which is similar to the western idea of settlement and reconciliation¹⁸. Islam is the only religion that is closely interested in revealing the truth and providing justice with minimum procedural hurdles. It has always esteemed *sulh* over court proceedings.

The predilection for *sulh* over litigation in Islamic culture often reflects larger social and cultural concepts of conflict in general. In most of the Middle Eastern region, for example, generally the idea of conflict is thought to be something disapproving

overtone. It is seen as a "mess" and a "risk" to social cohesion, and it should be prevented. This suggests strong measures to limit all types of disputes, even those that may be deemed "constructive" in other societies. The said mentality disapproves the mechanism of litigation for given its inherent negative components.

In the Islamic legal system, *sulh* is the ultimate approach to resolve disputes. For example, in Saudi Arabia more than ninety-nine percent of domestic conflicts settled through the way of arbitration. It is the common method of mediation and reconciliation aided by a judge or a prominent individual of the local population. During the settlement 'procedure, the arbiter tries to persuade the disputants to agree on a voluntary solution. The arbiter has the authority to propose a settlement plan, but not destined to force his own agreement on both the conflicting sides. Once the disputants are agreed on a final settlement, both the parties are bound to accept the decision and act on it wholeheartedly. After the effective transfer of all the rights in a case, the subsequent attempts of either party to file a related case to another person for arbitration will be rejected by an Islamic court¹⁹. Thus, in several respects, the Islamic arbitration is quite identical to Western-style of mediation.

A careful examination of ADR discloses that the role of an arbiter during the process of reconciliation is multifaceted. He generally mediates more actively during the process of negotiation. Instead of simply observing as a neutral person, he investigates the primary cause of dispute and analyzes the arguments of both the parties actively to decipher a plausible solution of the given problem. In many cases, the facilitator must achieve the way out without any initial face-to-face interaction between the two parties; otherwise, it might embarrass the conflicting parties or disrupt the situation²⁰.

In Islamic culture, the process of *sulh* can be varied with regard to the overall goal. In other legal systems, mediators emphasize common interests and solve cooperative problems with the aim of "separating the disputants from the issue". The process of *sulh*, however, takes exactly the opposite mechanism. Rather, it focuses on all related

matters and bears in mind repairing fragile relationships (personal or commercial) which are necessary to restore "harmony and solidarity" between the rival groups.

Although the mechanism of *sulh* is usually employed to solve all sorts of civilian disagreements, its widespread use is common in the civil conflicts. The public orientation of the *sulh* proves to be attractive for those parties particularly that seek to resolve internal disputes. Indeed, *sulh* generally works as the main tool for solving marital disputes, precisely in the hostile status of Islamic law for the act of divorce. The *sulh* negotiations in the marital context may be slightly different from other domestic issues. In such cases, extended family members often serve as arbitrator to settle the conflict. This practice is clearly supported in a Quranic chapter that says:

“If you fear separation between the two, appoint two arbitrators, one from man’s family and the other from women’s relatives; if they want peace, God will award reconciliation”²¹

The rationale behind the approach of *sulh* stems from the idea that the institution of family is the centre of Islamic culture. Since the marriage is largely the unification of two families instead of a couple, in order to create harmony in the society both the families must negotiate to settle marital disputes. Thus, the arrangement of arbiter from relevant families should not consider as an attempt to receive personal benefits, but a way of resolving conflict while enhancing the importance of Islamic family system.

The *sulh* is the Best Solution for Dispute Resolution

In the Islamic jurisprudence, the will of God is represented through laws which symbolize the absolute truth and justice. However, Islamic legal tradition has never questioned the desirability of settling a dispute through ADR mechanism. The Qur'an explicitly encourages the use of other mechanisms - collectively called as *sulh*. At one place, for example, the Qur'an verifies the ADR method:

Believers are only one fraternity: therefore, make peace and reconciliation between your competing brothers ...²²

Like several of other passages, this one indicates a preference for reconciliation rather than other forms of rivalry for governance in Islamic law. A close study of Islamic legal texts indicates that preference for *sulh* branches out both from the merits of *sulh* itself and from the perceived shortcomings in the formal process of litigation. In one of the hadiths, for example, the Prophet Muhammad ﷺ questioned the court process, given the potential persuasion of interested parties and the inherent error of human judges. Addressing the two conflicting sides, he warned that:

“I am only a human being and disputants contact me to solve their disputes, and one of them can present his case eloquently in a more convincing and impressive way than the 'other, and I rule in his favor believing he is sincere. So if I give the right of a Muslim to another person, then this property is a piece of fire, it is up to him to take it or leave it”²³.

This narration reflects a clear concern about the possibility of a miscarriage of justice which can result from the misleading tactics of the involved parties. Indeed, there exists such a doubt about litigation in the Islamic legal system. This is particularly true with regard to the use of lawyers, called agents. Islamic legal systems generally do not use professional advocates as they work in western legal systems. In many cases, the attorney can only appear as an agent or proxy of the absent side, not as their attorney. The reason for this prohibition is that professional lawyers "use mitigation techniques, add complexity to simple questions, distract the parties from their" moral obligations "and" spoil the moral mission of the trial court ". In such situations the Islamic mechanism assigns greater responsibility to the *qadies* who preside over disputes. The belief is that they can better verify the truth when the parties themselves represent, and at the same time remain available to guide and protect one or the other party during this process. However, the biggest advantage is that the Islamic jurisprudence gives greater discretionary powers to *qadies* in order to promote peace. “For example, if the judge felt that a settlement would lead to equitable results, he would aim - sometimes vigorously - to persuade the parties before him to reach an

agreement and settle their disputes in a friendly manner".²⁴ Thus, in many ways, the Islamic legal system embodies a marked tendency towards reconciliation. At least in part, preference stems from the fact that kindness compels the parties to resolve their differences and thereby avoids the concerns of miscarriage of justice inherent in prosecutions.

The Islamic tradition prefers the reconciliation process more than just condemning disputes. Indeed, the composition is qualified as "best judgment" because of its potential characteristics. As the Qur'anic verses at the starting of this discussion shows, it seems that Muslims have an essential duty to promote peace and solidarity with the Muslim community as a whole. Reconciliation or *sulh* plays an important role in achieving this commitment, as it avoids the compliments and misfortunes that often are attached with the beneficiary of dispute. Therefore, "the main purpose of conciliation and *sulh* is to put an end to conflicts and hostility between believers, so they can manage their relationships in peace and friendship"²⁵.

Conclusion

In the domain of ADR, Islamic arbitration provides an easy and cheaper mechanism to settle civil disputes according to Islamic interpretations. Especially, in the Pakistani settings scours are mostly interested to resolve their issues under the Islamic principles. Historically Pakistan was founded on the Islamic ideology and 98% of its population is Muslim. In the Islamic jurisprudence, the role of arbiter and its responsibilities are clearly established so any individual expert in Islamic jurisprudence can offer his services to Islamic society to resolve their issue under the Islamic regulations and practices. The scope of ADR is not just restricted to Islamic countries but it can be extended to Muslim diaspora in foreign countries.

References:

1. Dele Peter (2004), *ADR in Nigeria: Principles and Practices*, Dec-Sage Nigeria Ltd., Lagos
2. Strazisar, Borut. "Alternative Dispute Resolution." *Law: J. Higher Sch. Econ.* (2018): 214.

3. Lowry S. (1998). The Economic and Jurisprudential Ideas of the Ancient Greeks: Our Heritage from Hellenic Thought. T. Lowry & B. Gordon (eds.). *Ancient and Medieval Economic Ideas and Concepts of Social Justice*. Leiden: Brill, pp. 11–37.
4. Mahassini, Hassan. (1992)"General Principles of Islamic Law relating to International Commercial Arbitration'." *The ICC International Court of Arbitration Bulletin, Special Supplement* 3.1: 21.
5. Patai, Raphael, 2015, *Kingdom of Jordan*. Princeton University Press.
6. Hamidullah, Muhammad. "Administration of Justice in Early Islam." *Islamic Culture* 11.2 (1937): 163-71.
7. A. El-Tayib, 'The Ode (Qasidah), in The Cambridge History of Arabic Literature: *Arabic literature to the End of the Umayyad Period*, Cambridge: Cambridge University Press (1983).
8. Cunningham, Robert B., and Yasin K. Sarayrah. *Wasta: The hidden force in Middle Eastern society*. Praeger Publishers, 1993.
9. Al-Ramahi, Aseel. "Wasta in Jordan: a distinct feature of (and benefit for) Middle Eastern society." *Arab Law Quarterly* (2008): 35-62.
10. A.S.S. Owidi, 'Bedouin Justice in Jordan: The Customary Legal System of the Tribes and its Integration into the Framework of State Polity from 1921 onwards', Ph.D., University of Cambridge, 1982, 40.
11. A. Ahdab, *Arbitration with the Arab Countries*, Boston: Kluwer Law International, 1999. 11.
12. Kitab al-Aghani, Bulaq, 1285, vols. II, 164.
13. The Medjella of Legal Provisions, s.76
14. N.J. Coulson, *A History of Islamic Law*, Edinburgh: University Press, 1964.
15. *ibid*.
- 16 M. C. Bassiouni and G. M. Badr, 'The Shari'ah: Sources, Interpretation, and Rule Making' UCLA J. Islamic & Near E. L. 135.
- 17 Bellamy, James A. "THE MAKĀRIM AL-AKHLĀQ BY IBN ABI'L-DUNYĀ (A PRELIMINARY STUDY)." (1963).
18. Walid Iqbal, (2000) *Courts, Lawyering, and ADR: Glimpses Into the Islamic Tradition*, 28 Fordham Urb. L. J. 1035, 1035.
19. *Ibid*
20. Mohammed Abu-Nimer, *Conflict Resolution Approaches: Western and Middle Eastern Lessons and Possibilities*, 55 Am. J. Econ. & Soc.
21. Al-Qur'an 4:35
22. Al-Qur'an 49:10
23. Sahih Bukhari, Ahkaam 89:295, available at <http://www.usc.edu/dept/MSA/fundamentals/hadithsunnah/bukhari/089.sbt.html#009.089.295>.
24. Frank E. Vogel, (2000) *Islamic Law and Legal System: Studies of Saudi Arabia* 48 -50.
25. Walid Iqbal, (2000) *Courts, Lawyering, and ADR: Glimpses Into the Islamic Tradition*, 28 Fordham Urb. L. J. 1035, 1035.

THE CONDUCT OF MUSLIMS WITH THEIR NON-MUSLIM FELLOWS IN
PREDOMINANT MUSLIM REGIONS: A HISTORICAL PERSPECTIVE

Prof Dr. Sanaullah Bhutto University of Sindh, Jamshoro, Sindh, Pakistan

Dr. Saifullah Bhutto Associate Prof, Quaid-e-Awam University, Nawabshah, Sindh, Pakistan

Dr. Abdul Rahman Kaloi Assistant Prof. University of Sindh, Jamshoro, Pakistan.

ABSTRACT: Islam is a religion of love and peace, which teaches its followers to live in amicable and harmonious relationship with non-Muslims. Its policies of coexistence and cooperation with people of other religions entitles equal rights to all people irrespective of their race, and religion. As a result, non-Muslims residing in predominant Muslim countries enjoy equal citizenship rights like their Muslim brothers, such as the right of practicing the religion of their own choice. Indeed, Islam is a preaching religion; nonetheless, it never allows its followers to force others to embrace Islam. Instead, its propagation follows the rules of wisdom, equality, moderation, tolerance and preaching with best and gracious (glorious) ways. Islam teaches that religion is about willingness and freedom of choice, its elation is with heart and soul that cannot be won through force. In accordance with these teachings, historically, Muslims in Muslim ruled regions usually exhibited religious freedom to the extent to their non-Muslim fellows that various well-known and independent non-Muslim historians could not hide this fact and openly mentioned in their books. The set precedence of living with harmony and peace continues in Muslim dominated countries. The focus of this study is to present the stance of Muslims about religious freedom by narrating their gentle conduct with their non-Muslim fellows throughout history.

KEYWORDS: Religious Freedom, Religious Tolerance, Rights of non-Muslims.

Introduction:

Faith is defined as strongly believing in the existence or truthfulness of something. The Quran's stance on religion is: "Let there be no compulsion in religion: Truth stands out clear from Error" (*Al-Quran*, 2:256). Even the Messenger of Allah, who was the best preacher of Islam, was given the same rules and regulations for propagating Islam. "Invite [all] to the Way of thy Lord with wisdom and beautiful preaching; and argue with them in ways that are best and most gracious" (*Al-Quran*, 16:125). Therefore, it is compulsory to use wisdom and best words while preaching and propagating. The job of a Prophet is just to convey the message and not to convince people forcibly. "If it had been thy Lord's will, they would all have believed,- all who are on earth! wilt thou then compel mankind, against their will, to believe!" (*Al-Quran*, 10:99). It is clearly said about Prophet Muhammad (PBUH) that his job is to convey the message. If people turn their faces away from him, then it would be a loss only for them. "Say! Obey Allah and obey the Messenger, but if ye

turn away, he is only responsible for the duty placed on him and ye for that placed on you. If ye obey him, ye shall be on right guidance, the Messenger's duty is only to preach the clear [Message]" (*Al-Quran*, 24:54). Therefore the Holy Quran and Sunnah have categorically prohibited from using any kind of force and torture to convert non-Muslims to Islam, have forbidden the interference in the religious affairs of non-Muslims and have declared any such practice as being against the teachings of Islam (Syed Shuiab Akhtar 2005: 177).

Even the non-Muslim researchers and historians appreciate this balanced rule of Islam. Robertson, in his book *History of Sharlkan*, writes: "I declare that Muslims are the only nation, who kept aside their religious sentiments while dealing with people of other religions, even though they had wish to propagate and convert more people to Islam, but they gave those people freedom of choice who didn't want to leave their religion and embrace Islam" (al-Qarzavi, n.d: 16)&(Le Bon 2012: 137). In Islam, not only Jews and Christians have been given freedom of choice, but all people have freedom to follow any religion and have any religious belief. The Holy Prophet (PBUH) had many treaties with idol worshippers and the messenger of Allah maintained those treaties with them through words and in practice. Many of those non-Muslims embraced Islam even before expiration of those treaties, not because of fear of Muslims' swords, but solely because of good behavior and best conduct of Muslims. It is very clearly mentioned in the Quran that: "To you is your religion and to me is mine" (*Al-Quran*, 109:6). These few verses quoted above are the best example of charter of tolerance that has been unique in its nature. This charter clearly permits the idol-worshippers and pagans to carry on with their religious practices and beliefs. The verse (109:6) is openly announcing a charter of tolerance and open heartedness, which is not being practiced by any nation on earth today. It is because of those clear teachings of Islam about religious freedom that the Muslim jurists have set the rules of allowing non-Muslims living in Islamic countries to follow and practice the principles of their faith in all walks of life, particularly the laws of personal and family matters. Therefore, in an Islamic state, the non-Muslims would be allowed to deal with their personal and matrimonial issues in accordance with the teachings of their religion. Islamic laws will not be imposed on them and the Islamic Courts will be bound to give decisions according to the laws of their faith.

1. Freedom of Expression:

Along with religious freedom, the non-Muslims also have freedom of expression in an Islamic state, just like Muslims. In this regard, the rules and regulations are the same for both Muslim and non-Muslim citizens:

- (i) A non-Muslim can freely criticize the government, its orders and head of the state by staying in the jurisdiction of law.
- (ii) The non-Muslims have equal permission to have religious dialogue just as Muslims as permitted by the law without hurting anyone's sentiments.
- (iii) They are fully permitted to propagate and preach their religious doctrines; Islamic state would have no objection on that.

- (iv) A Non-Muslim would not be forced to adopt any belief or perform any religious ritual without his consent. He will have liberty to do anything that is not in conflict within the laws of the land.
- (v) Non-Muslims would completely be allowed to perform their religious rituals (Alvi, Dr. Khalid 2009, 606).
- (vi) In light of instructions given in (*Al-Quran* 6:108), it is necessary for both Muslims and non-Muslims to not use foul language for each other's religion and God(s).

(Muhammad Marmaduke Pickthall 2003: 127-128) writes that after conquering Egypt, Syria, Mesopotamia, Iran and North Africa, the Muslims not only gave full political independence to inhabitants of these lands, but they gave them freedom of choice and self-determination. The outcome of the spread of Islamic teachings was that people got rid of monopoly of the priests who had control over the ability of thinking of the masses. He further writes that Christians were given the right to protect their language and traditions. They were allowed to establish their religious schools; no restriction was imposed to meeting with foreign Christian missionaries or preachers.

2. Freedom to Practice Religious Rituals:

The Prophet's migration to Medina is supposed to be the beginning of the establishment of Islamic state. Upon reaching Medina, he made a treaty with the Jews of Medina which was known as Mithaq-e-Medina (Treaty of Medina). This treaty laid the foundation of Islamic society's ideology based on religious tolerance, peace and co-existence with the people of other religions. In this historic treaty, Islam's basic principles regarding rights & duties of both Muslim & non-Muslim citizens of Islamic state, religious tolerance and maintenance of peace in society were set. It was clearly written in that charter:

"Muslim and non-Muslim citizens would be entitled of political and religious rights equally. Similarly, entire nation would have all religious rights and autonomy".

As a result of that treaty, Jews and other non-Muslim minorities enjoyed all rights and privileges.

Once a Christian delegation from Najran was allowed to stay at Masjid-e-Nabawi and they were also allowed to conduct their prayers inside the mosque (al-Jauziyyah, Ibnul Qayyim 1982:3/639). Similarly, the Prophet gave in writing a charter for peace to the delegation of Najran which contained: "This is guarantee of messenger of Allah that Allah's protection will be with the people of Najran. Their lives, properties, country and religion will be under protection of Muslims. They will not be declined of their basic rights and there will be no interference into their religious affairs (al-Baladhuri 1983:76; al-Jauziyyah 1982:3/635). After the Prophet, the rightly guided caliphs and their successors carried on with the same policy. Therefore, Hazrat Umar gave in writing to the people of Æliathat that their lives, properties and churches were to be protected, no one would take over their worship places and nor anyone would interfere in their religious affairs (Arnold 2004, 80).

Many Christian churches had in them jewels and other precious items worth millions of pounds at Sinai, but due to freedom given by the Prophet of Islam and being under Muslim rule, they were protected and flourished (Muhammad Marmaduke Pickthall 2003, 125). During the period of rightly guided caliphs and caliphs after them, when the Islamic conquests expanded and many new areas entered in the Islamic empire, the Muslim rulers gave freedom of choice of religion to people of those areas and their worship places were respected. According to Arnold in his book *Preaching of Islam*, there are many examples which have been quoted by both Muslim and Christian historians. During the reign of Caliph 'Abd al-Malik in the city of Al-Raha, one wealthy Christian named Atnasus built a church in the name of Mary, mother of Jesus in his native town. He also built famous churches in Palestine and in Egypt while in many other cities, monasteries were built. Many Christians were in the service of Abdul Aziz bin Marwan, the governor of Egypt, who established a church named Quadees-e-Youhana in the city. In the days of Caliph Mehdi Abbas, a church was built for Christian prisoners of war in Baghdad. In the time of Haroon al-Rashid, a church was built in Baghdad for Somalis; during his time again NastoriMAtranSarjous built a church in his native town. Likewise, a huge church was built in Babel and the coffins of Prophet Daniel and Ezekiel were kept therein. During the reign of 'Abd al-Malik (685-705), a wealthy Christian of Edessa, named Athanasius, built a church in his native city and many others in various parts of Egypt (T.W 1913, 56).

When Caliph al-Ma'mūn (813-833) was in Egypt, he gave permission to build a church at al-Muqaṭṭam, a hill near Cairo. During the same caliph's time, a wealthy Christian, named Bukām, built in Būrah, Egypt (T.W 1913, 57) several churches with fine architecture plan.

It wasn't only Jews and Christians who were allowed to build and maintain their places of worship but other religious groups, like Hindus, were also treated in the same way by Muslim rulers. When Mohammad bin Qasim invaded Sindh during the time of Great Raja Dahir, he announced that no one should interfere with each other's places of worship. The people of Brahmanabad were allowed to rebuild their temples, nobody was to be forbidden or prevented from following his own religion, and the people were permitted to exercise their own creeds and laws. Muslims not only allowed establishing churches, but they allowed Hindus to build temples. Many Muslim governors donated lands for the construction of Hindu temples (T.W 1913, 206).

The same tradition was followed in Iran. (T.W 1913, 161) writes: "That this widespread conversion was not due to force or violence. This is the evidence of the toleration extended to those who still clung to their ancient faith. Even to the present day there are some small communities of fire-worshippers to be found in certain areas of Persia, although they have in recent years had suffered persecutions, their ancestors in the early centuries of the Hijra enjoyed a remarkable degree of toleration, their fire-temples were respected, and we even read of a Muhammadan general (in the

reign of al-Mu'taṣim, A.D. 833-842), who ordered an imam and a Mu'adhdhin to be flogged because they had destroyed a fire-temple in Sughd and built a Mosque in its place. In the tenth century, three centuries after the conquest of the country, fire-temples were to be found in Iraq, Fars, Kirman, Sijistān, Khurasan, Jibāl, Azerbaijan and Arrān, i.e. in almost every province of Persia".

In short, in accordance with the true spirit of Islamic teachings, people from every religion and sect have been enjoying their rights of freedom of religion, expression and worshipping in the Islamic reigns all over the world.

3. Islamic Teachings About Relationships with non-Muslims:

In (*Al-Quran*, 60:8), Allah says: "Allah does not forbid you to deal justly and kindly with those who fought not against you on account of religion nor drove you out of your homes. Verily, Allah loves those who deal with equity" (al-Hilali and Muhsin Khan 2011, 990).

No doubt, Islam is an eternal and divine religion; the weak and neglected are honored in it. Islam joins people of different races and classes together and teaches how to live together and it also teaches interfaith harmony among different religions. Through its teachings, Islam creates the greatest civilization; in worldly affairs Islam doesn't discriminate on the basis of caste, color, race or religion. Islam has laid the foundation stone of splendid civilization based on equality among human beings in basic rights of freedom of religion, protection of lives & properties and assurance of safety of others honor. There is no place for discrimination in Islam based on faith, race, language or ethnicity. All citizens have equal opportunities of having standard life and enjoy all privileges. Islam not only has permitted to have relations with non-Muslims but there are some aspects which have been stressed upon especially in terms of interaction with non-Muslims. Such as:

3.1. Marrying women from people of the Book:

In (*Al-Quran*, 5:5), Allah says: "This Day (all) good things are allowed to you; and the food of those who have been given the Book is lawful for you and your food is lawful for them; and the chaste from among believing women and the chaste from among those who have been given the Book before you (are Lawful for you); when you have given them their dowries, taking them in marriage, not fornicating nor taking them for paramours in secret" (Shakir, n.d., 66). In this verse, Allah clearly mentions that you can marry women from people of the book. In light of this verse, the companions of the Prophet, their successors and Muslim scholars in general agree on the legality of establishing matrimonial relations with non-Muslim women (al-Qurtubi 1967, 6:78). It is narrated from Jabir bin Abdullah that the messenger of Allah said: "We marry women from people of the book, but they don't marry ours"; also narrated from Umar that Prophet said: "A Muslim can marry a Christian woman" (al-Suyuti 1983:3/25). A great number of companions of the Prophet married Christian women and they found no harm in it (Ibn Kathir 1984, 2:20). This also shows that the dignity and prestige of a non-Muslim woman is taken in account just like a Muslim woman and the same kind of rights have been proclaimed for them for

which a Muslim woman is entitled.

3.2. Eating with People of the Book or Accepting Their Invitations:

In (*Al-Quran*, 5:5), Allah has clearly mentioned that one can eat the food of people of the Book (The Jews & Christians) and animals slaughtered by them are also allowed for Muslims to eat. There may be difference of opinion among the Muslim scholars on the issue of legality of animals slaughtered by people of the Book and that is purely based on the slaughtering procedure. However, Imam (al-Qurtubi 1967, 6:77) has mentioned the Muslim scholars unanimously agree on the issue that there is no harm in eating the food items of people of the Book other than the meat (in which slaughtering is involved) like fruits, veggies and cereals. The messenger of Allah's life proves that he accepted invitations from non-Muslims and ate from their food and he also invited them (Nisar Ahmad 2008:415).

3.3. Hosting non-Muslim Guests and Giving Gifts to non-Muslims:

The Messenger of Allah's life proves that he warmly welcomed the delegations from other areas; he was keenly interested in this, that he himself welcomed them with official protocol. He used to wear his best clothes at the time of meeting foreign delegations and ordered his accompanying officials to do the same. For example, at the occasion of welcoming a delegation from Kandah, the Prophet (PBUH) was dressed in fine garments. Hazrat Abu Bakr and Hazrat Umar were also dressed in similar garments (al-Kattani, n.d. 2/452).

As previously mentioned that a Christian delegation from Najran was allowed to stay in Masjid-e-Nabwi and they were allowed to conduct their prayers inside the mosque (al-Jauziyyah 1982:3/629). The companions of the Prophet followed his footsteps and exhibited the same kind of conduct to non-Muslims. In the caliphate of Hazrat Umar, on the occasion of the Conquest of Egypt, Hazrat Amr bin- al-A'as, set aside the grievances of the battlefield and accepted invitations from the Christians and also invited them (Nu'mani 1991:1/120).

3.4. Giving and Accepting Gifts from Pagans and People of the Book:

Exchanging of gifts is a good way to establish and maintain friendly relations with others. This practice brings love and affection in the hearts of people and helps remove personal grudges. The Prophet S.A.W knew this fact very well. He not only urged the exchange of gifts but he himself used to receive and give gifts and he did not show any discrimination in that practice. It is proven from Hadith that whenever the pagan relatives of the messenger's wives sent gifts, he allowed them to accept those gifts (Abubakr Siddique, n.d:272).

3.5. Visiting Patients and the Sick:

Among social activities, Islam requires and urges its followers to visit people who are sick. This is to encourage them to fight against illness and to show sympathy towards them in their difficult time. Visiting patients, asking them about their health's progress and praying for their prompt & lasting recovery was a regular activity of the messenger of Allah and he never discriminated in this matter based on color, caste, creed, race or religion. He occasionally visited sick people who were pagans. It is

reported that, even on the busy occasion of Hajjat al-Weda (His last pilgrimage), he visited the sick people and inquired about their health (Al-Bukhari, Abu Abdullah Muhammad b. Ismail, 1981:2/844-846).

3.6. Helping Those Who are in Need Without Discrimination of Religion:

There are countless examples from the life of the Prophet (PBUH) that he helped pagans and people of the book in time of need. Before the conquest of Mecca there was a drought and the messenger of Allah sent a huge amount of money of 500 gold coins to Abu-Sufyan and asked him to distribute them among the poor and needy people of Mecca (al-Sarukhsi 1993, 10:92).

Before the treaty of Hudaibiyyah, which opened the trade door for people of Mecca, the Quresh (the bitter opponents of the Prophet), were passing through difficult times due to a constraint of economic conditions. The Prophet did a business deal with Abu Sufyan by exchanging the best dates of Medina with the leather of Taif which was rotting due to the suspension of the Syrian route for trade (Muhammad Hameedullah 2009:204). Note that this is the same city in which its dwellers compelled the Prophet to migrate from it. It was a city where he was born, grew up and lived most of his life there. But when they were in difficulty, he came forward to help them. He overlooked the past atrocities he received from them and the fact that they had not accepted him as a prophet yet.

Conclusion:

The messenger of Allah not only taught tolerance, good conduct and patience to people without any discrimination of religion and race, but he practically showed it. Despite getting trials and tribulations from others, he dealt with them with good conduct and due to that, people in groups embraced Islam; enemies became his admirers and the practical example of the following Quranic verse was shown to the entire world:

“Remove sin with virtue, then verily he, between whom and you there was enmity, will be as though he was a close friend” (*Al-Quran*, 41:34).

The above discussion shows that Muslims in general have been tolerant, broad-minded and bear good behavior for people of other religions. They have showed good conduct individually, collectively and on a governmental level as well. The Muslims of today need to know the spectacular past of their ancestors and be tolerant to the followers of other religions. That is the only way one can conquer the hearts of people, develop a harmonious society and ensure humanity prospers.

References:

- Abubakr Siddique. n.d. *al-Mausoo`atulQazaaiyyah*. Lahore: Falah Foundation.
 Al-Bukhari, Abu Abdullah Muhammad b. Ismail,. 1981. *Sahih Bukhari*. Istanbul: Al-Maktabatul Islamia.
Al-Quran. n.d.
 Alvi, Dr. Khalid. 2009. *Islam Ka MuashartiNizam*,. Lahore: Al-Faisal Naashran o TaajranKutub.

- Baladhuri, Ahmad Ibn Yahya al-. 1983. *Futuh al-Buldan*. Beirut: DaarulKutubilIlmiyyah.
- Hilali, Muhammad Taqi-ud-Din al-, and Muhammad Muhsin Khan. 2011. *The Noble Quran*. Riyadh: Dar-us-Salam.
- Ibn Kathir, Isma'il bin 'Umar. 1984. *Tafsir Ibn Kathir*. 4 vols. Beirut: DaarulMa'rifah.
- Jauziyyah, IbnulQayyim al-. 1982. *ZaadulMa'ad*. 3rd ed. Beirut: MuessaaturRisaalah.
- Kattani, Muhammad Abdulhaye al-. n.d. *NizamulHukumatinaNabaviyyah*. 2nd ed. Vol. 2. 2 vols. Beirut: ShirkatDaarulArqam.
- Le Bon, Gustave. 2012. *Hadarat al-Arab*. Translated by Adil Za'eetar. Cairo: Hindawi Foundation.
- Muhammad Hameedullah. 2009. *Ahd-e-Nabavi Men Nizam-e-Hukumrani*. Lahore: Nigarshat Publishers.
- Muhammad Marmaduke Pickthall. 2003. *IslamiSaqaftaurdaur-e-Jadeed*. Translated by Torakina Qazi. Lahore: Manshoorat.
- Nisar Ahmad. 2008. *A'hd-e-Nabavi Men Riyasat ka Nasho-o-Irtiqat*. Lahore: Nashriyat.
- Nu'mani, Shibli. 1991. *al-Farooque*. 1st ed. Karahi: DaarulIsha'at.
- Qarzavi, Yusuf al-. n.d. *Ghairul Muslimeen fil Mujtama'ilIslami*. Beirut: MuessaaturRisaalah.
- Qurtubi, Abu 'Abdullah Muhammad ibn Ahmad al-. 1967. *Tafsir al-Qurtubi*. Vol. 6. 20 vols. Egypt: DaarulKitabil Arabi.
- Sarukhsi, Muhammad b. Ahmad al-. 1993. *Kitab al-Mabsoot*. Vol. 10. 31 vols. Beirut: DaarulMa'rifah.
- Shakir, M.H. n.d. *The Quran*. NSW, Australia: Abu Turab.
- Suyuti, Jalaluddin al-. 1983. *Dur al-Manthur*. 1st ed. 8 vols. Beirut: DaarulFikr.
- Syed Shuiab Akhtar. 2005. "MazhabiIntihapasandi ka JaizaSeeratnabavikeAaeeney Men" 1 (1): 157–77.
- T.W, Arnold. 1913. *The Preaching of Islam*. Second. London: Constable & Company Ltd.
- . 2004. *Preaching of Islam*. Translated by Sheikh Inayatullah. Lahore: MuhkamaMazhabiUmur-o-Awqaf, Panjab.

**FREEDOM OF EXPRESSION IN ISLAMIC AND WESTERN THOUGHT
(A CONCEPTUAL ANALYSIS)**

Dr. Riaz Ahmad Saeed, Department of Islamic Studies, NUML, Islamabad

Dr. Sumayyah Rafique, NUML, Karachi.

ABSTRACT

Freedom of expression is a new and little bit combative phenomenon in Islamic context, but we find enjoying equal importance in the contemporary Islamic and the Western sociopolitical context. Although their scope of appreciation is different but both thought equally recognize the issue of freedom of expression and its relevant areas and aspects. It is also a considerable issue that Islamic and the Western significance regarding freedom of expression are different. Islam gives importance to this fundamental human right due to human dignity and honor, to spread and search for truth etc. While in western context it's a sole right and you use it free anywhere any time without any objective. It is also claimed western of expression is a without any limit and boundaries. Human being will self-define its limits. It is basically a conceptual conflict between Islamic and western thought on this core issue. In this study effort are made to conceptually analysis the western and Islam point of view on this issue. In most of the issues Islamic thought conceptually contradicts to the western thought, however, in some areas both thought have consensus. Therefore, it is need of time that scholars should compare Islamic and western thoughts objectively. Comparative and analytical research methodology is adopting in this paper.

Keywords: Freedom of speech, Islam thought, western thought, conceptual analysis

Introduction: It is a historical fact that Islamic and western thought¹ have been opponent of each other from the centuries due to their diverse revealed and secular foundational sources respectively. So, the peace, physical and ideological war is part of the history on their fundamental sources. It is also an admirable discussion and thought that Muslims always try to adopt peace and peaceful co-existence with the West but these relationships were destroyed due to some misconceptions and incidents. Thus it is articulated through historical arguments that "The beginning of Muslim relations with West was very good. But after murder of Islamic Ambassador by Roman Governor it turned to hostility. Even, after effects of this incident can be felt up till now after many years of this incident".² It was the beginning of the thoughts of Islamic and Western interaction. This interaction was not in a peaceful environment but it was in the field of war and weapons. Therefore, from the day first, the Islamic and Western thoughts have become rivals of one another in every field of life. This opposition is due to their historical role and contribution in global socio-politics. Doubtlessly, Islam has a historical role to promote human rights, liberties and justice, when there was no one ready to raise a single voice for human rights. Once

international Human Rights Commissioner Marry Robinson said about Islamic thought most likely in OIC human rights summit;

“No one can deny that at its core Islam is entirely consonant with the principles of fundamental human rights, including human dignity, tolerance, solidarity and equality. Numerous passages from the Quran and sayings of the Prophet Muhammad will testify to this. No one can deny, from a historic perspective, the revolutionary force that is Islam, which bestowed rights upon women and children long before similar recognition was afforded in other civilizations”.³

There can be another factor for differences which are religious, Western thought historically links to Christianity and Islamic civilization links to Islam. According to my humble view, the Western thought is a combination of much humanism and ideas of human history. Many social, cultural, political and religious factors take part to make it. The basic difference between Islamic and Western thoughts is revelation, which makes it distinguish and sometimes opposite to the Islamic thought. Here, rightly observes from Islamic scholars that the Western civilization and thought is, “A purely materialistic civilization, its whole system is empty of any concept that favors a God centered life. It opposes Islam and seeks to eliminate those primary values on which Islamic thought stands”.⁴ Thus, it is said, both thoughts mostly contradict to each other but some time they have an academic and social concusses up on an issue. Freedom of expression is one of them. In this study efforts are made to conceptually compare the notion of freedom of expression in Islam and modern western thought. Hopefully, this study will prove fruitful in the relevant field.

Freedom of Expression in Islamic Context; Freedom of expression is most imperious and interesting issue in modern Islamic thought. It is also fact that one of the most significant objectives of the free expression in Islam is protection of human dignity. Therefore, Islamic scholars give highly protection and appreciation about the dignity of man under teaching of the Holy Quran. “Here it is frequently read and learn that in Islam personal Dignity is observed as basic and unchallengeable right, which is widespread and indispensable for human life. Even it cannot be challenged and change in any course of the Islamic tradition.”⁵ The second most imperative element to grant the freedom of expression in Islam is to search out and follow the truth in any case. Therefore, most of the Islamic teachings describe the truth and search of truth. Islam does not compromise on the truth and search out the truth. Even that one of the most beautiful name of Allah is al-Haq (the truth). In this course Islam does not care any blood or religious relation as affiliation. The Nobel Quran grants it in frequently and the teachings of the prophet ﷺ are more in this discourse. In clearer words the system of liberties and rights in Islam revolves around the core concept of human respect and dignity. Therefore, when we initiate or begin disunion on freedom of expression in Islam we cannot ignore the factor of human dignity and searching out the truth. Thus, Allah Almighty (the Creator and Owner of the universe) expresses the

dignity of human being in the Holy Quran with its spirit;

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

*“And We have certainly honored the children of Adam and carried them on the land and sea and provided for them of the good things and preferred them over much of what We have created, with [definite] preference”.*⁶

Moreover, according to the Islamic teachings, the right of freedom of expression is not due to any struggle or historical incident, but Allah Almighty grants all rights and freedoms alone as a unique gift to humanity to acknowledge their dignity and their capacity to search for truth. Moreover, In Islamic perception, the first prominent source of this fundamental human right is the divine revelation (*Wahī*). The last Prophet Mohammad (ﷺ) explained it by his sayings (*Aḥādīth*) and actions (*Sunnah*). Professor ‘Abdul Jabbār Shākir truly argues; “Islam grants all reasonable rights and liberties to human being without any historical struggle and efforts as compared to the modern West”.⁷ As well as Freedoms, liberties and human rights are not sole right and property of the west, but Islam provides these rights and liberties since its foundation. Professor Khurshīd Aḥmad says; “It is not a firm claim or solid argument, but just like a joke that the contemporary west is trying to become the sole proprietor of the human rights and civil liberties, while Islam granted these rights and freedoms fourteen hundred years ago”.⁸ The age of caliphate was the model era of all kinds of Islamic liberties and fundamental rights. Therefore, Sheikh Hāmid Anṣārī comments likely; “Ḥaḍrat ‘Umar’s (RA) era was the excellent period for freedom of expression and freedom of speech. It is his routine approach that he called people in Masjid of the Prophet Muhammad ﷺ, when an important issue occurred. Every person freely expressed his opinion in front of the Khalīfah (The Head). Also, He incorporated the spirit of common consultation in the Islamic Government”.⁹

Numerous historical evidences show that the concept and practice of freedom of consultation and thought which is a fundamental part of freedom of speech, expression and criticism in the Islamic state and society are found since the early ages of Islam. It is also a notable point that Islam grants these rights and liberties without any human efforts and struggle. Therefore, these rights and liberties are permanent and no power can alter or terminate them. Hence, Isrār-ul-Haq rightly observes, “The human rights and civil liberties in Islam are granted by Allah; these rights and liberties are not granted by any state or society. Therefore, no state or society, king or assembly, can prevent or eliminate them ultimately”.¹⁰ It is also from the great distinctiveness of Islam that Islam awards not only freedom and rights for human dignity, respect and physical survival but as well as, to search the truth and, social justice and for common goods. Therefore, as a point of its distinction Fathī Muhammad Othmān rightly comments;

“In Islam, the human being is not simply supposed to survive at the low level of biological endurance, but to enjoy the dignity, universality, and good life bestowed on him/her by Allah, and to grow all the human potentials, morally, spiritually and

academically, as well as physically”¹¹

In spite of it, the Western rights and freedoms are granted by man-made legislation, so they can eliminate and prevent them or they shall allow absolute freedom, and in this way they may harm the society. According to a scholarly comment; “Human rights are specific entitlements of different types and spectrum that are enacted by the legislature, under certain condition of thought, so as to practice by secular arrangements”¹² Thus, Islamic Rights and liberties are not absolute, but have some reasonable moral, legal and social boundaries to manage human oppressive behavior. Consequently, Islamic freedom of speech is not absolute but responsible. Mr. Ghulām Hassan Malik writes likewise;

“It is necessary to put some reasonable limits and restrictions in a civilized society on freedom of speech. So, in Islam, freedom of speech is not unlimited but some reasonable legal, social and moral restrictions are imposed on it”¹³

Moreover, the Islamic scholars have a consensus on this issue that the absolute freedom of expression is not possible anywhere and if provided it will create conflict and anarchy in the society. Islam grants liberties to a person with this responsibility that he may not harm any other person. Dr. Anwar al-Jundī says, “Islam by granting liberties to people put a duty that they will not harm or abuse other members of the society”.¹⁴ Accordingly, Islam understands that the absolute freedoms are not beneficial for human beings, but they can harm and damage the society. Mawlānā Mawdūdī argues, “The absolute right to freedom of expression can be harmful and destructive for ethical and moral values of the society and no law of any civilized society can bear it”.¹⁵ Accordingly, it rules out reliable moral, legal and social restrictions, which are meant to save the society from chaos and turmoil. In the Islamic context, the scholars count different approaches and their impacts on freedom of expression and other fundamental rights and liberties.

Moreover, in Islamic perspective, the right of freedom of expression is not due to any struggle or historical incident, but Allah Almighty grants all rights and freedoms alone as a unique gift to humanity to acknowledge their dignity and their capacity to search for truth. Moreover, In Islamic perception, the first prominent source of this fundamental human right is the divine revelation (*Waḥī*). The last Prophet Mohammad (ﷺ) explained it by his sayings (*Aḥādīth*) and actions (*Sunnah*). Professor ‘Abdul Jabbār Shākir truly argues; “Islam grants all reasonable rights and liberties to human being without any historical struggle and efforts as compared to the modern West”.¹⁶ As well as Freedoms, liberties and human rights are not sole right and property of the west, but Islam provides these rights and liberties since its foundation. Professor Khurshīd Aḥmad says; “It is not a firm claim or solid argument, but just like a joke that the contemporary west is trying to become the sole proprietor of the human rights and civil liberties, while Islam granted these rights and freedoms fourteen hundred years ago”.¹⁷ The age of caliphate was the model era of all kinds of Islamic liberties and fundamental rights. Therefore, Sheikh Ḥāmid Anṣārī comments likely;

“Ḥaḍrat ‘Umar’s (RA) era was the excellent period for freedom of expression and freedom of speech. It is his routine approach that he called people in Masjīd of the Prophet Muhammad ﷺ, when an important issue occurred. Every person freely expressed his opinion in front of the Khalīfah (The Head). Also, He incorporated the spirit of common consultation in the Islamic Government”.¹⁸

Numerous historical evidences show that the concept and practice of freedom of consultation and thought which is a fundamental part of freedom of speech, expression and criticism in the Islamic state and society are found since the early ages of Islam. It is also a notable point that Islam grants these rights and liberties without any human efforts and struggle. Therefore, these rights and liberties are permanent and no power can alter or terminate them. Hence, Isrār-ul-Haq rightly observes, “The human rights and civil liberties in Islam are granted by Allah; these rights and liberties are not granted by any state or society. Therefore, no state or society, king or assembly, can prevent or eliminate them ultimately”.¹⁹ It is also from the great distinctiveness of Islam that Islam awards not only freedom and rights for human dignity, respect and physical survival but as well as, to search the truth and, social justice and for common goods. Therefore, as a point of its distinction Fathī Muhammad Othmān rightly comments;

“In Islam, the human being is not simply supposed to survive at the low level of biological endurance, but to enjoy the dignity, universality, and good life bestowed on him/her by Allah, and to grow all the human potentials, morally, spiritually and academically, as well as physically”.²⁰

In spite of it, the Western rights and freedoms are granted by man-made legislation, so they can eliminate and prevent them or they shall allow absolute freedom, and in this way they may harm the society. According to a scholarly comment; “Human rights are specific entitlements of different types and spectrum that are enacted by the legislature, under certain condition of thought, so as to practice by secular arrangements”.²¹ Thus, Islamic Rights and liberties are not absolute, but have some reasonable moral, legal and social boundaries to manage human oppressive behavior. Consequently, Islamic freedom of speech is not absolute but responsible. Mr. Ghulām Hassan Malik writes likewise;

“It is necessary to put some reasonable limits and restrictions in a civilized society on freedom of speech. So, in Islam, freedom of speech is not unlimited but some reasonable legal, social and moral restrictions are imposed on it”.²²

Moreover, the Islamic scholars have a consensus on this issue that the absolute freedom of expression is not possible anywhere and if provided it will create conflict and anarchy in the society. Islam grants liberties to a person with this responsibility that he may not harm any other person. Dr. Anwar al-Jundī says, “Islam by granting liberties to people put a duty that they will not harm or abuse other members of the society”.²³ Accordingly, Islam understands that the absolute freedoms are not beneficial for human beings, but they can harm and damage the society. Mawlānā

Mawdūdī argues, “The absolute right to freedom of expression can be harmful and destructive for ethical and moral values of the society and no law of any civilized society can bear it”.²⁴ Accordingly, it rules out reliable moral, legal and social restrictions, which are meant to save the society from chaos and turmoil.

Freedom of Speech in Western Perspective; In the Western perspective, the scenario is entirely different on the scope of the freedom of expression. Doubtlessly, the Western scholars and all human rights instruments give it thorough going importance due to human liberty, equality, development and for human entertainment etc. This fundamental aspect differentiates the scope of freedom of expression in the Western perspective from Islamic point of view. One of the most key observations of the European Court of Human Rights goes to it. They stated that “Freedom of expression constitutes one of the essential foundations of such a society, one of the basic conditions for its progress and for the development of every man”.²⁵ Therefore, up till now many Western scholars have been elaborating and interpreting this fundamental right and liberty according to their own interest and style but one of the major similarities among these interpretations is human center liberty and for entrainment rather than for a most positive and constructive objective. This is also a dilemma that the Western liberty of free speech protects the idea of freedom but does not protect the personal dignity of human being as individual in general and collectively as special. Thus, a Western spokesman of the freedom of expression Kathleen Sullivan argues on this issue;

“This view of freedom of speech as liberty starts from a textual interpretation of the Free Speech Clause as “written in terms of ‘speech,’ not speakers. Unlike clauses that aim to protect “persons” from state coercion, thus, “Congress shall make no law abridging the freedom of speech,” without mentioning “persons” or denominating any ontological prerequisites for who or what may invoke its protection”.²⁶

This statement also elaborates this discussion that the Western thought has deep concern to human liberty and liberal entertainment but it has no concern to the moral and ethical side of human being because according to Muslim observation revealed ethics are not concern of the Western thought. From the above debate it can be easily observed and analyzed that the fundamental objective on the scope of freedom speech and of expression is totally different in Islamic and Western thoughts. Islamic thought focuses on spiritual and moral development but the Western thought focuses on political and material development. This difference is due to divinely revealed and non-revealed basis of religious and secular thinking.

There are many definitions found in Islamic and Western perspectives on freedom of speech but there is no specific and agreed upon definition of the freedom of expression in both perspectives, generally in Islamic and specially in Western context. Every person and group defines it according to its needs, requirements and interests. But till now the scholars could not succeed to reach on the unanimous and comprehensive definition of the term freedom of expression. Here, Hāshim

Kamālī's²⁷ views are more important and considerable. He speaks on the discourse of definition of freedom of expression in an academic manner. According to him, "definitely, there are many attempts have been made by academicians, writers, scholars and observers to define freedom (of expression) but till now they cannot open to some level of uncertainty and doubts".²⁸ It is also observed the definition of term freedom is different in the Eastern and the Western context. Even some religious interpretations make it more critical to this term. For example, some religions use the term freedom as freedom from sins and evils and Sufi school of thought use it in entirely different way. Therefore, it is summed up from the above academic debate that the Islamic concept of freedom including freedom of speech and expression is totally different from the Western stand point, for example when we review the definition of the freedom of expression and Speech in Islamic perspective, the study finds out some moral, social and legal limits and restrictions which bound and limit it for the sake of individual and society. Here from Islamic context Mr. Ali Muhammad Bhat defines it most suitable to Islamic teachings, "Freedom of expression means the right of an individual to prefer the stance about certain public or private issue and express them before others avoid of delinking, seemly or evil when it is obscene, immoral or harmful".²⁹ This definition or interpretation basically limits the freedom of speech in some religious, moral and social perspectives. This definition is also opens that Islamic concept of freedom of expression is not unlimited or absolute but it has some reasonable limits and boundaries and every person can enjoy his liberty under these boundaries and limits.

Instead of it the Western scholars advocate maximum freedom of expression and reject or dislike all kind of restrictions and limits on human freedom. In Western context the New World Encyclopedia defines the freedom of expression with any limit and boundary. He opens this debate that "Freedom of speech is the capability to speak without any restriction. It is also called freedom of expression, it refers not only to oral speech but any act of corresponding information or ideas mean written communication".³⁰ It is observed from Western literature and legal perspective, not only encyclopedias and dictionaries but also the Western human rights instruments (UDHR³¹, ICCPR³² and ECHR³³ etc.) and constitutions also promote maximum freedom of speech as we pronounce in the United human right instrument which is globally implanted and appreciated and known as Universal Declaration of Human Rights, "Everyone has the right to freedom of opinion and expression, this right includes freedom to hold opinions without interference and to seek, receive and impart information and ideas through any media and regardless of frontiers".³⁴ Contrary of it, the Islamic (Cairo) Declaration of Human Rights (CDHR³⁵) bounds it with (Shari'ah) Islamic laws and some other moral and social restriction. It opens the discussion that "Every human being has the right (and freedom) to enjoy his legal capacity in terms of both obligation (duties) and commitment (responsibilities)".³⁶ In between the lines the researcher, categorically agrees that in Western perspective also have some limitations and restrictions but these limits are minimum or do not

implanted with their legal and political spirits so these are insufficient to save the society from its controversy. Furthermore, these very difficult near to impossible to prove these limits and restrictions on national and international level freedom of expression. Therefore, Muslim scholars observe that the Western concept of freedom of expression is different from that of Muslims due to claim and propagation of unlimited and freelance freedom. According to an eminent advocate of absolute freedom of expression and speech from western perspective, John Stuart Mill³⁷;

“In the West the freedom to say what you like, to criticize the authorities, and to discuss ideas openly and without fear, is agreed to be of fundamental importance. What there is less agreement about is when this freedom may be properly curtailed. It may seem surprising, then, that Mill devotes most of his famous account of these matters in *On Liberty*”.³⁸

It besides gives a clue to absolute freedom of expression that, in modern Western discourse any kinds of limits or control to freedom is considered as its negative impact. Therefore, from above advocacy of maximum freedom of speech and expression, majority of Western scholarship and public has faith in absolute freedom of speech. Although it does not exist or even not possible in the East and West both but their mind set is not ready to accept any kind of limits, sanctions and restrictions on freedom of expression and speech, because due to secular approach maximum liberty have become part of their behaviors. Many studies show that the Western scholars promote maximum freedom of expression to individuals. When we overview the Western thought and academicians, seems like they deliberately propagate the concept absolute and unlimited notion of freedom. For example, in Western thought there is found an idea of positive and negative freedom. The most interesting issue is that they grade negative freedom as maximum freedom and positive freedom as limited freedom. The well-known theory of the Western scholar Ishaia Berlin totally revolves around this issue. Moreover, it is also a fact of the history in the contemporary era the negative concept of liberty has become dominant due to Western advocacy of unlimited freedom of expression.

“From the 16th Century Liberty has been considered mainly in its negative concept as an opposition to authoritarian prescriptions and restraints in Religion Government and Economics. In this it expresses the philosophy of individualism that found its first modern expression in the Renaissance and Reformation”.³⁹

It is also observed, impartial Western scholars also recommend some limits and sanctions for freedom of expression, and a noticeable voice of them is David H. Bialy. He defines it in this way, “The absence of restraints upon the ability of individuals or group to communicate their ideas to others, subject to the understanding that do not in turn coerce others into paying attention or that they do not invade other rights essential to the dignity of others”.⁴⁰ Although there is found a group of scholars who do not favor the limited freedom of expression and opinion but these voices are not dominant in the contemporary Western society. According to my observation the majority of Western scholars like and propagate the freelance concept of freedom of

expression, although practically it is not possible. If we read and analyze the modern philosophy of civil liberties and rights, the Western scholars allow everything to express and speech in the name of freedom of expression. Even most of them advocate the freedom of Pornography[\] and demand its rights. The most interesting issue is that according to the Islamic scholars it is craziness, radicalism and abuse of humanity in the name of freedom.

Comparison in Islamic and Western Contexts: When we categorically try to examine the Islamic and Western concepts of freedom of expression we find some major conflicts. The Islamic concept of freedom is based upon the revelation and revelation is not a result of human experience. It is the word of Almighty Allah for all humanity and base for all Islamic legislation, rights and liberties. These are fixed and nobody has authority to make amendment in it even the Prophets. The Western concept of freedom of expression depends upon human mentality and rationality. The human mindset is limited and fluctuates from person to person, so it focuses on materialistic approach and wants to get rid of all kinds of social and moral sanctions. I think the concept of unlimited freedom of expression may harm the society because every person is not responsible and think only for his individual benefit. In every civilized country the laws are set to limit and to discourage chaos but the power of morality is superior to laws.

According to the Islamic scholarship, Islam presents much variety of the freedom of expression, the main areas of the freedom of expression are, for example, freedom of opinion, freedom of religion, freedom of thought, freedom of press, freedom of criticism, freedom of association, freedom to get and spread knowledge (academic freedom), freedom of consultation. The contemporary Western thought also discusses major areas of the freedom expression. According to the Encyclopedia of Philosophy; “Freedom in the abstract is a class comprising many species -freedom of thought and speech, freedom of association , freedom of Assembly, freedom of worship, freedom of movement , freedom in the use or disposal of property, freedom in the choice of one’s employer or occupation and so on”.⁴¹

The Western scholars also describe a wide range of the freedom of expression, for example, freedom of opinion, freedom of religion, freedom of thought, freedom of press, freedom of criticism, freedom of Assembly association, Academic or intellectual freedom, freedom of election or Right to vote etc. As well as, an interesting information and knowledge about Islamic and Western freedom of expression is that all Western national and international constitutions and human rights instruments and claims freedom of speech as right and liberty but the Islamic thought considers the freedom of expression right and as duty both. According to the Islamic point of view sometimes the freedom of expression becomes an obligation for the Muslim society and individual. Allah declares about this responsibility as;

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

“The believers, men and women, are Awliyā’ (helpers and friends) of one another; they enjoin Al-Ma’ruf (good), and forbid from Munkar (bad)”.⁴²

Thus, Dr. Fathī considers the freedom of expression as a duty of a Muslim; “Freedom of expression and information, constituting both a right and a duty for every believer, should be established and maintained by all Muslims - men and women, rulers and ruled”.⁴³ This and many other evidences show that in Islamic perspective and Muslim world view, the freedom of expression, speech and criticism are part of their ethical and religious obligations. Sometime this freedom of expression and speech is seen as a fundamental right; sometime it is observed as a duty and mostly it is declared as both of them together.

It is clearly observed, that the Islamic and Western thoughts represent different worldviews thus; they adopt different approaches to solve every socio-political and ethical issue. Accordingly, the solution and result of both thoughts differ to each other and most of time contradicts to each other. Unremarkably, there are many reasonable distinctions located in the Islamic thought which differentiate it from the Western concept of thinking and practicing. One of the most vital themes is freedom of expression and speech.

The first most important difference of the Islamic freedom from the Western freedom is that, it is responsible and limited one. Of course, it is a big quest of the modern day, especially in Western perspective; either freedom of expression can be restricted through law or moral values to prevent sedition and conflict with other socio-religious values or it should leave free for everyone at all. Here, in some extent, the Islamic freedom of speech is very sensitive and demands responsibility because it is granted by Almighty Allah instead of any court, parliament or constitution. Hence, Islam does not allow hurting anyone under the shadow of freedom of expression and speech. Although, Islam accepts free speech as a fundamental right of people but does not allow anyone to spread mischief under the cover of freedom of speech and expression. So for that purpose Islam puts some legal and ethical restraints and limits up on it for the sake of societal peace and prosperity. According to a leading Islamic scholar Prof. Dr. Fathī Osmān Muhammad views;

“Any speech and expression cannot by any way persuade a digression from Islamic values or a perpetration of what is forbidden. A discussion which may happen about the faiths and the laws of Islam must observe neutrality and avoid illegal offense, confrontation and provocation”.⁴⁴

The second most vital difference of Islamic freedom of expression is that it keeps balance between liberties and responsibilities, while the Western freedom of speech mostly leave balance between freedoms and responsibilities. It is also a notable point that Islam does not totally ban freedom of expression but sometimes limits it for some important socio-political objectives and benefits. Here, Dr. ‘Abdul Ḥakīm Hassan comments, “Islam does not want to put complete restriction on freedom of expression any time, even in e sedition and anarchy, but Islam has given some principles and limits for the freedom of expression”.⁴⁵ Therefore, Islamic approach to freedom of

expression differ it from Western approach of freedom due to its responsibility and objectivity. Hence a renowned scholar Dr. Afzalur-Rehman rightly observes;

“The Western trend of freedom is a license to like and dislike without any moral restrictions but in Islam there is another concept of freedom and West is not aware of this. It is an objective right from Allah with some restrictions and responsibilities”.⁴⁶

The third most significant difference from the Islamic perspectives on freedom of expression is that Islam focuses on morality, divinity and spirituality but the Western approach focuses on secularism, liberalism and humanism. In other words, the Western laws do not care the moral and spiritual side of human being but they protect and safe the secular side of human being because divine ethics have not much concerned to the Western thought including freedom of expression. Thus, it is observed that the Western liberties and rights are human centered while Islamic liberties are moral centered. It is fundamental difference between Islamic Western approach towards liberties and rights. Here, Misbah Taqi assumed;

“(In the West) if freedom threatens the life, health and properties of human beings, the law will put a restraint on it (Otherwise not).....(But in Islam) The lawmakers have to observe the spiritual and divine interests while the Islamic government has to prevent that which is harmful to the spiritualities of human beings both”.⁴⁷

Obviously, this most substantial difference of opinion fundamentally differentiates the Islamic concept of freedom of expression from the Western concept of freedom of expression.

The fourth most important aspect of freedom of expression in Islamic and Western context is that Muslim are not so crazy or sensitive in their liberties because their religion grants all kind of liberties with some limits and without putting any struggle. They are well aware from their rights, liberties and responsibilities. They believe in Allah, the Creator of universe and He grants all kind of rights and liberties to Muslims. These rights and liberties are not due to any historical revolution, struggle, king, parliament or convention. So, they are less sensitive than Western people. The Western scholarship and public is more sensitive for rights and liberties because they get their rights after a long, horrible and tough struggle in the history. They fought for their liberties with church, barons and kings. Therefore, now they have unseen fear and do not ready to compromise on their rights and liberties.

Another fundamental difference between Islam and West is that Islam relates freedom with social justice and exploring of truth but considers them same. Thus, it is assumed, “In Islamic perspective there is no place of any freedom including freedom of expression and speech without justice, and these two values freedom and justice have been the inspiration and motivator of the great revolutions in the world, be they political, economic or social”.⁴⁸ Therefore, when we analyze and compare the Islamic and Western concepts of freedom of expression we find some major conflicts. The Islamic concept of freedom is based upon the revelation and revelation is not a result of human experience. It is the word of Almighty Allah for all humanity and base for all Islamic legislation, rights and liberties. These are fixed and nobody has authority

to make amendment in it even the Prophets. The Western concept of freedom of expression depends upon human mentality and rationality. The human mindset is limited and fluctuates from person to person, so it focuses on materialistic approach and wants to get rid of all kinds of social and moral sanctions. I think the concept of unlimited freedom of expression may harm the society because every person is not responsible and think only for his individual benefit. Although in every civilized country the laws are set to limit and to deter chaos but the power of morality is superior to the laws.

The fifth fundamental difference between Islamic and Western concept of freedom of speech is that the objectives of the Islamic freedom of expression and speech are different one from the Western objectives. One of them have to construct the society not destruct it or for not just the sake of human entertainment and liberty. “According to Islamic teachings, freedom of expression is an important duty as well as a fundamental human right for construction of the society not for the destruction and human entertainment only”.⁴⁹ While contrary to this, the Western thought considers philosophy of civil liberties and rights as human entertainment and abstract right, the majority of Western scholars allow everything to express and illustrate in the name of freedom of expression and speech. Even most of them advocate the freedom of pornography and obscenity and demand its rights openly as human entertainment. Most interesting thing is that according to Islamic scholars it is craziness, radicalism and abuse to humanity in the name of freedom of expression but the Western thought considers it as a right of entertainment for human being. Therefore, Islamic scholars observe , “Islam grants the right to free speech for transmission of goodness not for evil and this concept of freedom of expression is better than that of the West(as well differ one)”.⁵⁰

It is also perceived the Islamic principles provide boundaries and limitations of freedom of expression but the West wants to keep it an absolute right and liberty which is not bearable. Moreover, Islamic freedom of speech and expression are responsible but the Western freedom of speech is freelance and sometime it becomes a right to abuse. Here, Dr. ‘Madnī accurately commented, “The freedom in Islam is like allowance of movement to a horse tied with a rope. It is like an authority which implies responsibility and accountability and provides the justification for the Day of Judgment (but the West is empty from this feature)”.⁵¹ Keeping in view, although the words and terms look like same in Islamic and Western concept of freedom of expression but actually the Islamic freedom of speech is ultimately different from the Western notion of freedom of speech. Therefore, it is noticed, the Western concept of freedom of expression is basically a right to defame other’s values, religions and ethics and that kind of freedom is not compatible with Islamic divine teachings. In famous words we can say it is right to abuse rather than freedom of expression and speech. Therefore, if we wish for a peaceful, harmonized, modest and humble society then it is necessary to adopt the unique principles of the Quran and the Seerah of the

Prophet ﷺ.

Keeping in view, Islam cares the individual rights and liberties but it is most careful about the collective norms and values of the society and tries to keep a balance between liberties and responsibilities. On the behalf of this study I would like to say, it is not more than a leashed propaganda against Islam that it bans the rights and liberties and it opposes dignity and freedom of a person. While the fact is that Islam does not ban the freedoms and rights but make balance between rights and duties, liberties and responsibilities As well as, at the same time, Islam cannot overlook a fact accepted by modern legislation, namely in some cases freedom of expression may be limited provisionally or partially to retain other human rights, public goods and national interests. Therefore, in most of the Islamic countries legislations, even in this modern era, freedom of speech is bounded with social and moral values and public interests.

Here, I would like to sum up the discussion that Islamic and Western thought are equally like freedom of expression and speech but there are some major differences on the behalf of their interest, sources and historical perspectives. For example, Muslim interest in freedom of expression and speech is due to religion and its preaching, consultation and behalf of it welfare and transformation of the society, criticism and behalf of construction of government and public behavior, freedom of association and behalf of it to initiate joint efforts for the sake social welfare religious strengthen and betterment of the individual and society. In other word the Islamic concept of freedom of expression revolves around the social justice and exploring of truth. At that point Abdul Hay Madni raises a valid argument;

“In Islam there is no freedom (including freedom of expression) without justice and these two values freedom and justice have been the inspiration and motivator of the great revolutions in the world, be they political, economic or social”.⁵²

Contrary to this, in Western perspective, the basic objective of the liberty in general and specific in case of freedom of expression and speech are entirely different. According to the researcher's view, the foremost objective of the freedom of expression is to enjoy their personal lives, wishes and personal interests. Due to lack of religious spirit preaching is not their basic objectives. Furthermore, due to conflict with religion they have no revealed ethics so their manmade ethics are not enough to control whims but every person and scholarly school of thought have its own interpretation of ethics and laws. In very simple words, Islamic concept of expression is entirely different from the Western concept of freedom. Both are entirely contradicted to each other. There is no similarity between them except terms and meanings. Therefore, a well-known Western scholar Eric Kolig precisely rightly stated about the view point of Muslims regarding western freedom of expression;

“Freedom of speech is considered in the West a high public good and an important social value, underpinned by legislative and ethical norms. Its importance is not shared to some extent by conservative and devoted Muslims, who read Islamic

doctrines in ways seemingly incompatible with Western notions of freedom”.⁵³

History is an eye witness of the issue that every thought and ism (religion) which does not believe in revelation of Almighty Allah could not become beneficial to the humanity. It can be perceived from the above discussion that contemporary Western thought is not much different according to its impacts and demerits for humanity because this can be said that things are known from their fruits. The current socioeconomic and sociopolitical scenario of the Globe is testifying the notorious impacts of Western thought. Accordingly, we can observe that human being is much suffering from the venom fruits and impacts of the contemporary Western civilization.

Conclusion;

On the behalf of above study there are some important conclusions are drawn;

1. Islamic thought is a revealed thought while the western thought is a man mad thought, so both have major differences on many issues, freedom of expression is one of them.
2. Sometimes terms and literal definitions are look like same but their actual interpretation and means are interlay different.
3. On limits and boundaries of freedom of expression Isalmaic and western thought have contradiction to each other.
4. In Isalmaic thought freedom of expression is not a sole right but it is a privilege on the behalf of duty and responsibility, while in western thought issue is entirely different.
5. Freedom of expression as scope and right is same in Isalmaic and western thought but in details and explanation they are entirely different o each other.
6. Islamic concept of freedom has some major differences from the western concept of freedom of expression. Some of them are; it is a responsible one, divine one, limited one and correlated with moral and social values.
7. It is also a notable point that western rights and liberties protect only personal and materialistic interests of a man but Islamic philosophy of rights protects spiritual and collective interests of the man and society as well.

References:

¹Western thought: In academic context, West is not considered as a piece of land. It is a dominant thought and civilization which was developed after reformation and renaissance movement in the context of Judio-Christian tradition, Roman laws, Greek philosophy, secularism, liberalism and modern sciences. Now, it has become an antagonist of Islam from past many years.

²Ḥamīdullāh, Muhammad, *The Prophet of Islam* ﷺ (Lahore: Beacon Books, 2011), 347.

³Suhaila Nik Saleda, “A conceptual analyses of rights in international and Islamic human rights instruments”, *American international Journal of Contemporary Research* 2:4(2012):155-164.

⁴Mawdūdī, Syed Abū al-A‘lā, *Islam and the Secular Mind* (Karachi: Islamic Research Academy, 2008),76.

- ⁵Kamālī, Muhammad Hāshim, *The Dignity of Man* (Cambridge: Islamic Text Society, 2002), 9.
- ⁶Sūrah al-Isrā' 17:70.
- ⁷Shākir, 'Abdul Jabbār, "Tohīn-e-Risālat aur Maghrib", *Mahnāmah Da'wah* 14:11(2008):3-13.
- ⁸Khurshīd Aḥmad, "Secular Democratic Rights and Blasphemous Caricatures", *Policy Perspectives* 7:2 (2010):20-53.
- ⁹Anṣārī, Mawlānā Hāmid, *Islam kā Nizām-e-Hukūmat* (Lahore: al-Faisal Publishers, n. d.),112.
- ¹⁰Isrār-ul-Ḥaq, *Islam Aur Magharib kā Taṣādum* (Lahore: Bait-ul-Hikmat, 2007), 133.
- ¹¹Fathī, *Human Rights in Contemporary World; Problems for Muslims and Others*, 3.
- ¹²Aṭṭīyah Naīm, *Contribution in the General Theory of Freedoms* (Cairo: Dār al Ghowmīyah, n. d.), 161.
- ¹³Malik, Ghulām Hassan, "Islam aur Āzādī-e-Izhār", *Monthly Da'wah* 14:11(2008):50-55.
- ¹⁴Jundī, M. Anwar, *Qaḍāyā al-'Aṣr wa al-Mushkilāt al-Fikr fī Zaw al-Islam* (Beirut: Dār al-Fikr, 1984), 177.
- ¹⁵Mawdūdī, Syed Abū al-a'lā, *Khilāfat-o-Malūkīyyat* (Lahore: Idāra Tarjumān al-Quran, 1999), 261.
- ¹⁶Shākir, 'Abdul Jabbār, "Tohīn-e-Risālat aur Maghrib", *Mahnāmah Da'wah* 14:11(2008):3-13.
- ¹⁷Khurshīd Aḥmad, "Secular Democratic Rights and Blasphemous Caricatures", *Policy Perspectives* 7:2 (2010):20-53.
- ¹⁸Anṣārī, Mawlānā Hāmid, *Islam kā Nizām-e-Hukūmat* (Lahore: al-Faisal Publishers, n. d.),112.
- ¹⁹Isrār-ul-Ḥaq, *Islam Aur Magharib kā Taṣādum* (Lahore: Bait-ul-Hikmat, 2007), 133.
- ²⁰Fathī, *Human Rights in Contemporary World; Problems for Muslims and Others*, 3.
- ²¹Aṭṭīyah Naīm, *Contribution in the General Theory of Freedoms* (Cairo: Dār al Ghowmīyah, n. d.), 161.
- ²²Malik, Ghulām Hassan, "Islam aur Āzādī-e-Izhār", *Monthly Da'wah* 14:11(2008):50-55.
- ²³Jundī, M. Anwar, *Qaḍāyā al-'Aṣr wa al-Mushkilāt al-Fikr fī Zaw al-Islam* (Beirut: Dār al-Fikr, 1984), 177.
- ²⁴Mawdūdī, Syed Abū al-a'lā, *Khilāfat-o-Malūkīyyat* (Lahore: Idāra Tarjumān al-Quran, 1999), 261.
- ²⁵Brid Moriarty (ed.), *Human Rights Law (Handyside v UK)* (Oxford University Press, 2012), 283.
- ²⁶Kathlīn M. Sullivan, "Two Concepts of Freedom of Expression", *Harvard Law Review* 124:1 (2010):143-178; <http://harvardlawreview.org/2010/11/two-concepts-of-freedom-of-speech>.
- ²⁷Prof. Dr. Hāshim Kamālī: He is one of the most prominent Muslim scholars in modern era. He is afghan citizen completed his graduation from Kabul University. He did his PhD from London University. He has served many world leading institutes. He has worked as professor and faculty Dean at international Islamic university Malaysia from 1985- 2004. He is an author of several academic books and articles on Islamic jurisprudence, human rights and contemporary issues. Now he is CEO of Institute of Advance Islamic Studies at Malaysia.
- ²⁸Kamālī, Muhammad Hāshim, *Freedom of Expression in Islam* (Kuala Lumpur: Berīta Press, 1994), 8.
- ²⁹Bhat, 'Alī Muhammad, "Freedom of Expressing from an Islamic Perspective", *Journal of Media and Communication Studies* 6:5 (2014),72.
- ³⁰Bram, Leon L. (ed.), *Funk and Wagnall's Encyclopedia* (New York: Funk & Wagnall, 1985), 24:262.
- ³¹UDHR: It stands for the Universal Declaration of Human Rights. In contemporary era it is considered as most important document from the united nation on international, level. It was announced by the UN on 1948.
- ³²ICCPR: Stands for International Convention on Civil and Political Rights. It is an international, the most significant human rights instrument which firmly manages to provide and respect the fundamental human rights and civil liberties for its signatories. It was adopted and implemented by UNO General Assembly on March 23, 1976.
- ³³ECHR: Stands for European Convention on Human Rights is an international convention to protect human rights and political freedoms in Europe. Drafted in 1950 by the Council of Europe and implemented on 3 September 1953. All European states (47) are member of the Convention. The Convention established the European Court of Human Rights . Any person who feels his or her rights

have been violated under the Convention by a state party can take a case to the Court. Convention has 16 protocols with several articles.

³⁴Alfreosson, Guomundur, *The Universal Declaration of Human Rights: A Common Standard of Achievement* (London: Martinus Nighoff Publishers, 1999), Article 19:256.

³⁵CDHR: It stands for Cairo Declaration of Human Rights which was declared by the Muslim scholars of the Organization of Islamic Countries (OIC) at Cairo in 1990. Major rights are same as were in mentioned in UDHR but some useful amendments was suggested in UDHR with special reference to Shrī'ah.

³⁶Lawson, Edward (ed.), *Encyclopedia of Human Rights* (Washington: Taylor & Frances, 1996) CDHR, Article 8:177.

³⁷John Stuart Mill: He was a prominent English active politician, thinker and economist. He was born in 1806 in UK. He got his early education from his father, who was also a well-known Utilitarian scholar. His point of view was different from his father's. He worked as editor in the 'London Review'. He also actively participated in active British politics from 1865-1881. He is also considered a modern liberal scholar due to his important work on liberalism.

³⁸Will, Cartwright, "Mill on Freedom of Discussion", *Richmond Journal of Philosophy* 15:4 (2003):1-7 ; www.richmond-philosophy.net/rjp/back_issues/rjp5_cartwright.pdf.

³⁹David T Holland, *The Encyclopedia Americana* (Danbury: Grolier Inc., 1986), 17:303.

⁴⁰Bailey, David H, *Public Liberties in the New States*. New York: Rand McNally, 1964), 27.

⁴¹Paul, Edwards (ed.), *The Encyclopedia of Philosophy*. New York: Macmillan & Co., 1967), 3,:223.

⁴²Sūrah al-Tawbah 9:71.

⁴³Fathī, Uthmān Muhammad, *Huqūq al-Insān Bayna al-Sharī'ah al-Islāmīyyah wa al-Fikr al-Qānūnī al-Gharbī* (Beirut: Dār al-Shurūq, 1982), 113.

⁴⁴<http://topbooklibrary.com/download/Freedom+Of+Expression/> Accessed; 25/1/2019.

⁴⁵Al-Īlī, Abdul Ḥakīm Hassan, *al-Hurrīyyah al- 'Āmmah* (Beirut: Dār Fikar al-Arabī, 1983), 484.

⁴⁶Afzal-ur-Rehman, *Shakhṣī Āzādī (Personal Liberty)* (Lahore: Feroze Sons, 1993), 60

⁴⁷Misbāh, Muhammad Taqī, *Freedom the unstated Facts* (Isfahan: ABWA Publishers, 2006), 51.

⁴⁸Madanī, 'Abdul Haiyy, "Freedom and Its Concept in Islam, Conference on Humanities", *Historical and Social Sciences* 17 (2011), 117.

⁴⁹Muhammad Ismā'īl, *Questions on Islam* (Lahore: al- 'Atīque Publishers, 2009), 43.

⁵⁰<http://www.mubashirnazir.org/human> rights in Islam and west/ Accessed; 27/1/2019.

⁵¹Madnī, *Freedom and Its Concept in Islam*, 117.

⁵²Madnī, *Freedom and Its Concept in Islam*, 116.

⁵³Kolig Erich, *Freedom of Speech and Islam* (London: Ashgate Publishing Company, 2014), I.

PROPOSING SUITABLE SHARĪ'AH COMPLIANT FINANCING SOLUTION TO THE BUSINESSES FROM INDUSTRY PERSPECTIVE

Aijaz Ali Khoso

Zahid Chana

Zahoor Ahmed Abbasi

ABSTRACT: *This paper highlights the importance of understanding (i) the features, risks and practical implications of modes of financing used by Islamic banks and, (ii) the business model of the customer in order to propose suitable and suitable Sharī'ah compliant financing solution to the businesses. Lack of understanding in this regard may cripple the provision of ensuring strict Sharī'ah compliance guidelines in true letter and spirit. The paper also emphasis the need of rigorous capacity building of Islamic banking staff, awareness Sharī'ah sessions for customers and other related parties so that everyone know the role and responsibility expected from them while dealing in Islamic banking products and services.*

Keywords: *Islamic Banking, Sharī'ah compliance, Business model, sustainable growth*

Introduction

Ensuring Sharī'ah compliance is the basic fiduciary responsibility of the Islamic banking institutions (IBIs). Faith-driven customers patronize their savings in Islamic banks because they believe that financial transactions carried out in these institutions are in conformity with Sharī'ah principles (Shome, et al., 2018). Perception of Sharī'ah non-compliance may negatively affect the reputation and image (Azrak, et al., 2016) as well as the long term sustainability of these institutions (Rosman, et al., 2017). Since Islamic banks are not merely the money lenders, they are actively involved in the trade, business and production process, in order to structure a customized financing solution that best suits the financing requirements and business needs of their valued customers. Hence, the staff of Islamic banks requires a blend of knowledge: deep understanding of Sharī'ah-compliant modes of financing and clarity of financial requirements and business model of the customers. Lack of understanding of Islamic financial contracts; features, associated risks, practical limitations and implications may lead to proposing an incorrect business solution which may cripple the provision of ensuring strict Sharī'ah compliance in the Islamic banking institutions.

This paper calls the attention of all the stakeholders to take further measures to enhance the knowledge-level of their Islamic banking staff, and even the customers and the other related parties for establishing Islamic banking on the strong foundations, which shall not only ensure better Sharī'ah compliance in the institutions today, but also give the opportunity to reap the benefits of real business-based model of banking tagged with long-term and sustainable growth of the industry.

How Islamic Banking involve in Businesses?

Islamic banks use multitude of trading structures and business relationships in order to fulfill the needs and financial requirements of their customer. They buy assets and commodities from the suppliers and sell it to the customers on profit, they acquire assets from the vendors to further lease them on rent, they become partner in the businesses to share profits and losses and they provide wide-range of services to get wages and commissions. Whatever the case may be, they are actively involved in

trading and production process of businesses.

Exposing to buying and selling of commodities, renting of cars and houses, participating in profit and loss sharing, providing services as per the customer needs means knowing the way of doing a variety of businesses, no matter whether it is a trading business or manufacturing concern or distribution or hybrid of all. In doing so, Islamic banks ought to understand the market norms, the terms and conditions, the industry and products related risks, the pricing and payment mechanisms, the inventory management techniques, transportation and delivery of goods, method of separation of goods, nature of purchase and sale evidences of every business sector which differs from industry to industry and product to product.

To satisfy the customers' needs which ranges from working capital management to long term financing needs, Islamic banks have structured number of financial products and services in order to deal with different industries and businesses. They have number of trade-based modes like Mūrabaha and Mūsawamah for working capital financing needs, Istisnā and Salam for liquidity management needs, Sarf for trading in currencies and Tijarah for finished goods financing. They have participating modes like Musharakah and Mudarabah for deposit mobilization and running finance needs. They have leasing mode for renting cars and houses etc. Therefore, instead of renting of money as conventional banks in majority cases, Islamic banks are using multitude of business structures and relationships for their business customers.

A step forward, Islamic banks offer product-variants to best suit the customer requirement. For example, they have multiple financing structures of Mūrabaha. Even in each product-variant, the transactional process-flow differs from customer to customer, product to product and industry to industry. The process-flow of Mūrabaha, for example, for buying and selling of cotton is different from the process-flow of Mūrabaha for furnace oil. The cement industry deals differently from iron and packaging industry. The risks in import Mūrabaha are different from local Mūrabaha. The method of separation of goods is different in pharmaceutical industry from edible oil industry. The method of payment to farmers in unorganized market varies from the one used in automobile market. Still the list is not complete, only for one mode i.e. Mūrabaha, because the way of doing business is boundless.

One of the important inferences from the above storyline is that each financial contract and business transaction in Islamic law has its own essence. Without going deep into the philosophy of why Islam permits these so many contracts, every contract is allowed for facilitating the specific human business need. Mūrabaha is allowed along-with Mūsawamah. What we are experiencing in contemporary Islamic banking, in certain cases where Mūrabaha cannot be used, Islamic banks have the liberty to use Mūsawamah. Same is the case with Istisnā and Salam and so on and so forth.

Based on the background discussed so forth, it is easy to apprehend the theme of the paper, 'Proposing Suitable Shari‘ah Compliant Financing Solution to the Businesses'. Hence, it is pertinent that Islamic bankers involved in financing activity, in one way or the other¹, need to understand which mode is exactly suitable for

satisfying customer business needs. At first instance, it looks simple, but practically it is not easy. What it requires from the Islamic banking staff, the customers and the other stakeholders like suppliers, vendors and even Muqaddam is outlined in the section below.

The required skills and knowledge

First step in proposing the correct Sharī'ah-compliant financing alternative is the deep understanding of the features, risks, practical limitations and implications of each available financing alternative in the bank's portfolio. For example, Mūrabaha is a 'trust sale' which implies that if the bank receives any discount from the supplier, the same shall be transferred to the customer. Similarly as a 'sale contract' whereby a commodity is bought and sold, Mūrabaha cannot be used for catering OPEX requirements like paying electricity bills. However, Istisnā may be used in such cases, since the Islamic banks are concerned with 'manufactured goods' at maturity. Similarly, Istisnā means manufacturing a thing from raw material involving labour, therefore, for selling finished goods already available in stock, Istisnā is not suitable but certainly Tijarah is.

Second step in this way is correctly identifying the customer business need to ascertain the purpose for which customer requires the funds. It is done through a detail discussion with the customer; whether he requires the funds for meeting working capital management requirement like buying raw materials or paying wages & salaries or for long-term financing needs like buying machinery or any other equipment. Once the need is correctly identified, it is the time to align the customers' financing requirement with available financing alternatives with the bank by choosing the best, the one which satisfy the financing need without hampering the Sharī'ah principles. Once these basic steps are completed, the credit proposal is reviewed and approved if the credit and risk related requirements are met. It is important for Risk Management Group (RMG) at this stage to consider the Sharī'ah compliance risk at par with other business risks².

Third step in this regard is drafting a transactional process-flow. This is the most critical step whereby the step by step way of doing business is explained. It also defines the responsibilities of credit administration department, the business team (usually the Relationship Managers of the bank) and the Sharī'ah staff.

This is the stage where RMs and Sharī'ah staff are expected to be vigilant. They are required to understand that how the customer is doing business? The customer, in all such cases may be a corporate client, SME, a firm or a sole-proprietor with different risk profile and industry dynamics. Why it is important that all the bank staff involved must understand the business cycle of the customer? Here are some of the reasons:

- ❑ Sharī'ah team normally vets the credit application/ proposal of the customer,
- ❑ Business team deals actively with the customer and draft the transaction process-flow which is then approved by the Sharī'ah,
- ❑ Understanding the inherent risks and applying proper Sharī'ah controls in each step of the process-flow,

- ❑ Understanding the Sharī'ah-compliance risk, its dimensions in product to product and industry to industry,
- ❑ Ensuring that the steps and documentation of each transaction are executed in true letter and spirit,
- ❑ Conducting effective client visits.

To understand customer business cycle, Islamic banks usually use a Customer Information Sheet (CIS) to collect the business related information of the customers that helps in drafting the transactional process-flow. For example, a customer requires the credit to purchase raw material. A suitable mode in this regard is Mūrabaha. The business and Sharī'ah staff needs to understand the following dimensions:

Point to understand	Description	Example
<i>What is the nature of the business of the customer?</i>	Whether the customer is involved in trading activity or manufacturing or distribution or using a mix of these activities.	Textile industry – a manufacturing concern
<i>What kind of raw material is used by the customer?</i>	Name of the assets, goods or commodities purchased by the customer as a raw material.	Cotton, Polyester etc.
<i>Who are the providers of this raw material?</i>	The list of suppliers or vendors or contractor is asked from the customer.	Textile industry purchases cotton from farmers or middle-men.
<i>How the suppliers pack the raw material?</i>	Type of packing includes bags, sacks, drums, cartons and the raw material is sold without any packaging i.e. Open	Sacks
<i>Is there any prior relationship of customer & supplier?</i>	It is necessary to confirm if there is any blood relation or prior contractual relationship between customer and supplier to avoid Bai' Enahor fictitious transaction etc.	Normally textile industry has long contractual relationship with suppliers. They purchase cotton other than bank finance.
<i>What is the mode of payment to the supplier?</i>	Either the bank pay directly to the supplier or vendor or credit the customer account for pay-order, demand draft, online slips etc. In some cases, physical cash is also paid.	Usually indirect payment is made to the suppliers. Where farmers do not have bank account, physical cash is paid. Extra controls are applied to ensure that the cash is not used for other purposes by the customer.

Some of the sample questions mentioned in the chart shows that nature of each business need to be evaluated to prepare a customer specific transaction process-flow. The list is not exhaustive. It only covers some of the areas of supplier-side. The customer-side is separately understood. For example, how customer manages the inventory? Following questions may help in this regard:

Point to understand	Description	Example
<i>How customers ensure the separation of banks goods from own his goods?</i>	Whether they use separate go-downs? Or if same go-down is used the separate by Tagging/ Bin-cards. In case of liquid like oil they	Bin Cards

	inventory is managed on Musha.	
<i>What is the inventory holding period?</i>	To ensure that the offer & acceptance is done before inventory is sent for work in process.	It differs from season to season. Normally, textile industry holds inventory for 60 – 90 days.
<i>What is the inventory usage method?</i>	Whether it is FIFO or AVCO.	FIFO

Hence, for drafting a customized alternative for businesses, all the variables that affect the way of doing business need to be understood in order to ensure Sharī'ah compliance in true letter and spirit.

A step forward, understanding of customer also matters. For example, in Mūrabahatransaction, customer must understand the importance of the fact that the goods purchased under Mūrabaha are owned by the bank and cannot be used by him before declaration and offer and acceptance stage (Mūrabaha contract). If customer has taken more than one product-lines like for example Mūrabaha and Istisnā, customer (even Muqaddam) should know the difference and purpose of different documents used in different products. For example, customer and Muqaddam sometimes mix 'Mūrabaha Declaration' with 'Goods Receiving Note (GRN)' of Istisnā transaction. Therefore, since Islamic banks are practically involved in business and production process by offering trade-based modes, lease-based modes and participation-based modes they must have deep understanding of features and risks of Islamic modes of financing as well as the business model of the customers. This shall lead to:

1. Understand the nature of business.
2. Understand the customer and customer-related Inherent risks including Sharī'ah compliance risk.
3. Apply requisite Sharī'ah controls.
4. Prepare process-flow according to customer needs in light of Sharī'ah principles.
5. Each party understands the roles and responsibility at each step of the transaction.
6. Avoid fictitious transactions e.g. offering Mūrabaha for paying electricity bills.
7. Avoid fake invoicing and other purchase and sale evidences for covering up the transaction.
8. Avoid loss of income (If any anomalies are detected at later stages in Sharī'ah audit and Sharī'ah compliance reviews).
9. Help in conducting an effective and informed customer visits.
10. On the other hand, any negligence in this regard leads to cripple the provision of Sharī'ah compliance in Islamic banks, which is mainly and the only reason for their existence. The Product Development staff is expected to involve actively with business team and customer to understand and facilitate the transaction.

Conclusion & Recommendations

Although at this stage, Islamic banks use certain arrangements to avoid excessive involvement in trading and production process like making agency agreement, however, to ensure Sharī'ah-compliance in true letter and spirit and for the long and sustainable growth of Islamic banking, it is need of the hour to equip the Islamic banking staff with:

1. Deep understanding of Islamic modes of financing, the features, risks and practical implications and sanctity of documents used in each transaction.
2. Ability to identify the correct financing need of the customer.
3. Understand business model of the customer in order to propose suitable Shari'ah-compliant solution.
4. Following steps may be taken in this regard,
- 5. Enhanced Training & Capacity Building Measure of Islamic Banking Staff**
 - a. Extensive training of all the related staff including credit, risk, credit, risk management, audit, compliance, business teams and Shari'a staff on business-models and Shari'a is required. State Bank of Pakistan (SBP) has taken an initiative encouraged Islamic banks to train their staff and create a culture of continuous learning for development of knowledge and capacity in Islamic banking industry (SBP, 2018).
- 6. Awareness Sessions for the General Public & Customers**
 - a. Training & awareness sessions for customers should be arranged so that the customer should be capable to understand their role and responsibilities.
- 7. Strong Industry-Academia Collaboration**
 - a. For long-term sustainable growth, there is a need to teach applied knowledge of Islamic banking & finance to under-grad and grad students. The dilemma with the academics is that their sole focus is teaching the theory. The more specific application of Islamic modes is required. The academic institutions should engage industry practitioners having hands-on knowledge of the practices.

8. *This is a preliminary article to start the discussion that why it is important to understand the nature of Islamic financial contracts and their practical application in Islamic banking and finance. Islamic banking & finance professionals and industry practitioners are encouraged to share their practical experiences while offering Islamic financial modes so that the industry insights may help all stakeholders to understand the industry and product related risks. Suggestions and comments are welcome saarim.iu@gmail.com*

Bibliography

- Azrak, T., Saiti, B. & Engku Ali, E. R. A., 2016. An Analysis of Reputational Risks in Islamic Banks in Malaysia with a Proposed Conceptual Framework. *Al-Shajarah: Journal of the International Institute of Islamic Thought and Civilization*, Issue Special Issue, pp. 331-360.
- Rosman, R., Azmi, A. C. & Amin, S. N., 2017. Disclosure of Shari'ah Non-Compliance Income by Islamic Banks in Malaysia and Bahrain. *International Journal of Business and Society*, 18(1), pp. 45-58.
- SBP, 2018. *Enhanced Training & Capacity Building Measures for Islamic Banking Institutions (IBIs)*, Karachi: State Bank of Pakistan.
- Shome, A., Jabeen, F. & Rajaguru, R., 2018. What drives consumer choice of Islamic banking services in the United Arab Emirates. *International Journal of Islamic and Middle Eastern Finance and Management*, 11(1), pp. 79-95.

¹ This includes business team (corporate/ commercial or SME), credit administration department, risk management group, product and Shari'a team.

² Discussing the credit approval process and explaining each step in detail is out of the scope of this paper.